حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

اکتوبر 2018ء
-/30روپے

UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی تنظیم ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی اجلاس و مشاعرہ میں خطاب کرتے ہوئے۔
شہ نشین پر مولانا محمد رحیم الدین انصاری صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی' ممتاز شعرائے کرام جناب صلاح الدین نیر' جناب جلال عارف'
جناب سردار سلیم' ڈاکٹر محسن جلگانوی و دیگر دیکھے جاسکتے ہیں

مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکتہ کے زیر اہتمام منعقدہ دوروزہ قومی سمینار ''علامہ جمیل مظہری: حیات وخدمات'' کے پہلے ادبی اجلاس میں
پروفیسر بیگ احساس، صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے۔ شہ نشین پر ڈاکٹر دیبر احمد، ڈاکٹر اظہر عالم اور جناب جہانگیر رضا کاظمی دیکھے جاسکتے ہیں

بنیاد گذار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ | شمارہ: ۱۰ | ماہ: اکتوبر | سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

- ہندوستان: **300** روپے
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے

قیمت: **-/30**

- کتب خانوں سے: **400** روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

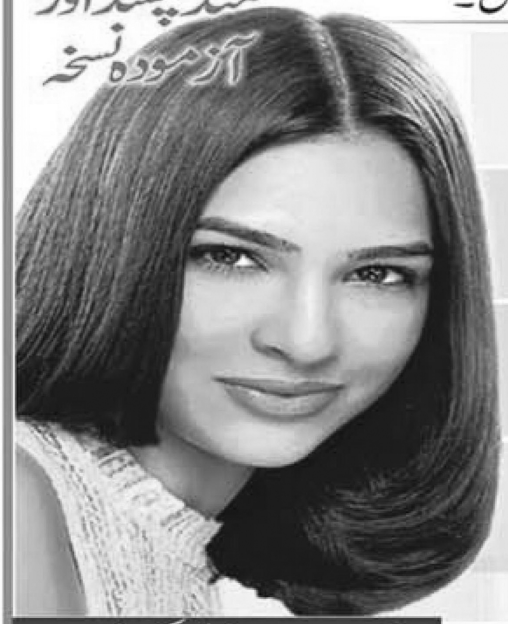

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	7

مضامین

ساقی فاروقی سے گفتگو	افتخار عارف	9
عبدالصمد کے نئے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا معروضی وتنقیدی جائزہ	علی احمد فاطمی	15
''شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف''	شرف النہار	28
رضاء الجبّار فکر وفن	رفیعہ سلیم	34
ڈاکٹر عباس رضانیر کی تنقیدی بصیرت	غلام نبی کمار	44

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا اشرف رفیع	54

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ	سعیدہ بانو احمد	58

شاعری

غلام مرتضیٰ راہی، عابد علی عابد، خالد عبادی، نبیل احمد نبیل	پی پی سریواستورند، جنوں اشرفی، رفیق ساجد، پروین شیر، شارق عدیل	63

افسانے

آصفہ	محبوب پاشا اعظمی	71
کوئی دوسرا شامل کر سکتے ہیں تو دیکھئے (وقت کم ہے)	رند سرشار	75

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	مبارز احمد، علیزہ بتول، میر سمیع اللہ بختیاری، منیزہ مہوش، یونس جمیل، سراج یعقوبی	80

اداریہ

علاقہ پرستی.....!

شمالی گجرات کے ضلع سابر کنتھا میں ایک چودہ ماہ کی لڑکی کا ریپ کیا گیا۔ مجرم کا تعلق ہندی زبان بولنے والوں سے ہے یعنی وہ یوپی یا بہار کا کوئی مزدور ہے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گجرات میں پھیل گئی اور یوپی، بہار کے افراد کو حملوں کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ یہ واقعہ ہمت نگر میں ہوا۔ لڑکی کا تعلق ٹھاکروں سے ہے۔ مہسانہ، گاندھی نگر، احمد آباد اور وڈوڈرا میں یوپی بہار کے افراد پر شدید حملے کیے گئے۔ ٹائمز آف انڈیا کی خبر کے مطابق مہیپت سنگھ راجپوت جو گجرات، یوپی اور مدھیہ پردیش کے درمیان بس چلاتا ہے، اس کا بیان ہے کہ تقریباً پچیس ہزار افراد احمد آباد سے اپنے وطن چلے گئے۔ یوپی اور بہار کے باشندے یہاں کی فیکٹریوں میں بحیثیت مزدور کام کرتے ہیں ان کے وطن لوٹ جانے سے 20% پیداوار کم ہوگئی۔ اس طرح ان غیر ریاستی ورکرز کی واپسی کا اثر سورت، کچھ، مورِبی، جام نگر اور راج کوٹ پر بھی پڑا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نفرت کی یہ آگ کانگریس کے لیڈرس ماہوت ٹھاکر اور ایم۔ ایل۔ اے اور الپیش ٹھاکر نے پھیلائی جو کانگریس پارٹی، گجرات کے سکریٹری بھی ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ غیر گجراتیوں کی وجہ سے جرائم کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ گجراتی ان افراد کی وجہ سے بے روزگار ہو گئے ہیں۔ اس نفرت آمیز رویے کی وجہ سے حالات بے قابو ہو گئے ہیں۔ گجرات کے لیبر اور ایمپلائمنٹ منسٹر نے بیان دیا ہے کہ وہ ایک ایسا قانون بنانے پر غور کر رہے ہیں کہ گجراتیوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع ملیں۔ گجرات میں انڈسٹری قایم کرنے والوں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ 85% گجراتیوں کو روزگار فراہم کریں اور باقی 15% دیگر ریاستوں کے ورکرز کو موقع دیں۔

ایک کمسن لڑکی کا ریپ انتہائی گھناونی حرکت اور ناقابلِ معافی گناہ ہے مجرم کو اس کی سزا دی جانی چاہیے۔ لیکن اس بہانے تمام غیر گجراتیوں پر حملے کرنا اور انھیں گجرات چھوڑنے پر مجبور کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ یوپی اور بہار کے چیف منسٹروں نے گجرات کے چیف منسٹر سے اس سلسلے میں گفت وشنید کی ہے۔ ماضی میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ ممبئی میں شیوسینا اسی غرض سے بنائی گئی تھی۔ 1960ء میں شیوسینا کے مراٹھی بولنے والے افراد اور بال ٹھاکرے نے جنوبی ہند کے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں ممبئی چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ 1970ء میں بیس ہزار بنگالی میگھالیہ کے نوجوانوں کا نشانہ بنے اور ریاست چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ 1980ء میں ایک لاکھ بنگالیوں کو تری پورہ چھوڑنا پڑا۔ 83-1980ء میں سینکڑوں خاندانوں کو بہار چھوڑ کر منی پور جانا پڑا کیوں کہ مقامی افراد نے ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ 1991ء میں کاویری کے پانی کے مسئلے کو لے کر جنوبی کرناٹک میں تامل بولنے والوں پر حملہ کیا گیا اور ہزاروں لوگوں نے کرناٹک چھوڑ دیا۔ 2000ء میں شیوسینا اور ایم۔ این۔ ایس نے ہندی بولنے والے یوپی بہار کے لوگوں کو نشانہ بنایا۔ مسئلہ وہی بیروزگاری کا تھا۔ 2012ء میں جنوب مشرق کے باشندوں کو بنگلور والوں نے تنگ کیا مغربی آسام میں اقلیتوں پر حملے کیے گئے۔ بنگالیوں کو

بھی نشانہ بنایا گیا تھا۔

یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ آسام میں پی۔ آر۔ سی کے نام پر 40 لاکھ باشندوں کے نام نیشنل رجسٹر آف سٹیزنس میں شامل نہیں ہیں ان میں 32 لاکھ مسلمان اور 8 لاکھ ہندو ہیں جنھیں بنگلہ دیشی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں۔ امیت شاہ نے بیان دیا ہے کہ بی جے پی، پی آر سی پر سختی سے عمل کرے گی۔ اگر یہ رجحان پھیلتا جائے تو ہندوستان کی سالمیت کو شدید خطرہ ہے۔ اس طرح ملک خانہ جنگی کا شکار ہوسکتا ہے۔ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

حکومت کو بھی اس بات پر غور کرنے کی ضروت ہے کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ حیدرآباد میں ای ٹی وی اردو (اور اب نیوز 18)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور حیدرآباد، سنٹرل یونیورسٹی، آئی آئی آئی ٹی، آئی ٹی کمپنیوں میں حیدرآبادیوں کی شرح فی صد کتنی ہے؟ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں صرف ایک وائس چانسلر حیدرآباد سے رہا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں آج تک کسی حیدرآبادی کو وائس چانسلر نہیں بنایا گیا۔ ناانصافی کا شدید احساس، علاقہ پرستی کا شدید رجحان، اپنے علاقے کے لوگوں کو نوازنا اور، مقامی افراد کو نظر انداز کردینا۔ ایک لابی بنا کر مقامی لوگوں کو تنگ کرنا، مقامی سرکردہ ہستیوں سے روابط نہ رکھنا۔ شہر سے سارے فوائد حاصل کرکے اپنے وطن اور اپنی تہذیب کی برتری جتانا۔ اپنے الگ جزیرے بنانا اور مقامی افراد سے گھل مل کر رہنے کی کوشش نہ کرنا، سارے شہر سے کٹ کر اپنی دنیا میں مگن رہنا، یہاں کی سماجی وثقافتی زندگی میں کوئی رول ادا نہ کرنا یہ ایسی باتیں ہیں جو مقامی لوگوں میں غصہ پیدا کرتی ہیں۔ اور پھر کسی بہانے یہ لاوا آتش فشاں کی طرح بہہ نکلتا ہے۔ حیدرآباد یونیورسٹی میں سید احتشام حسنین، وائس چانسلر بن کر آئے تو انھوں نے مقامی افراد سے بھی ربط قایم رکھا تھا لیکن دوسری مرکزی جامعات کے وائس چانسلرز نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی۔ نہ یہاں کی سماجی وتہذیبی زندگی کا حصہ بنے۔

ہم علیحدگی پسندی کی ایسی ہر کوشش کی مذمت کرتے ہیں۔ ملک کا کوئی بھی باشندہ کسی بھی ریاست اور علاقے میں رہنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن مسائل جب سنگین روپ اختیار کرلیتے ہیں تو ہر پہلو پر غور کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی سطح پر بھی یہی رجحان غالب آرہا ہے۔ امریکہ نے باہر سے آنے والوں پر راستے بند کردیئے ہیں، سعودی عربیہ میں مہاجرین پر ٹیکس عاید کرکے اور ہر کمپنی میں سعودی باشندوں کے تقرر کو ضروری قرار دے کر برصغیر کے افراد کے لیے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ لندن، آسٹریلیا، یا یوروپی ممالک میں بھی سکونت اختیار کرنا اب آسان نہیں رہا۔ یہ علاقہ پرستی اور نفرت کی سیاست دنیا کو تباہی کے دہانے پر لے آئی ہے۔ ایسے کسی بھی رجحان کی شدید مخالفت اور احتجاج کی ضرورت ہے۔

سب رس کی مشمولات پر پسندیدگی کا اظہار قارئین فون اور واٹس ایپ پر کرتے ہیں۔ براہِ کرم ای میل یا خط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کیجئے تاکہ ہمارا حوصلہ بندھا رہے۔

بیگ احساس

شاعرہ،مصورہ،ادیبہ پروین شیر کی چوتھی کتاب

بے کرانیاں

دو انعام یافتہ شعری مجموعے، کرچیاں اور نہال دل پر سحاب جیسے ، ایک تخلیقی سفرنامہ چند سیپیاں سمندروں سے (تینوں دو لسانی..اُردو ٫انگریزی، کوفی ٹیبل، مصوری کے ساتھ)کے بعد ... بے کرانیاں .. . دو لسانی (اردو۔انگریزی) ،مصور نظموں کا مجموعہ شایع ہوگیا ہے۔

''میں ان نظموں کو پڑھتا چلا گیا اور ان کے سحر میں کھو گیا۔ پروین شیر اتنی اچھی اور کھری شاعر نکلیں کہ میں دنگ رہ گیا۔تخلیقیت اور دل سوزی میں ڈوبی ہوئی ایسی پُر اثر آواز.....نظموں میں یورپی اور فرانسیسی اثرات نے کچھ جادو سا گھول دیا ہے۔ میں سکتے میں رہ گیا''۔

گوپی چند نارنگ

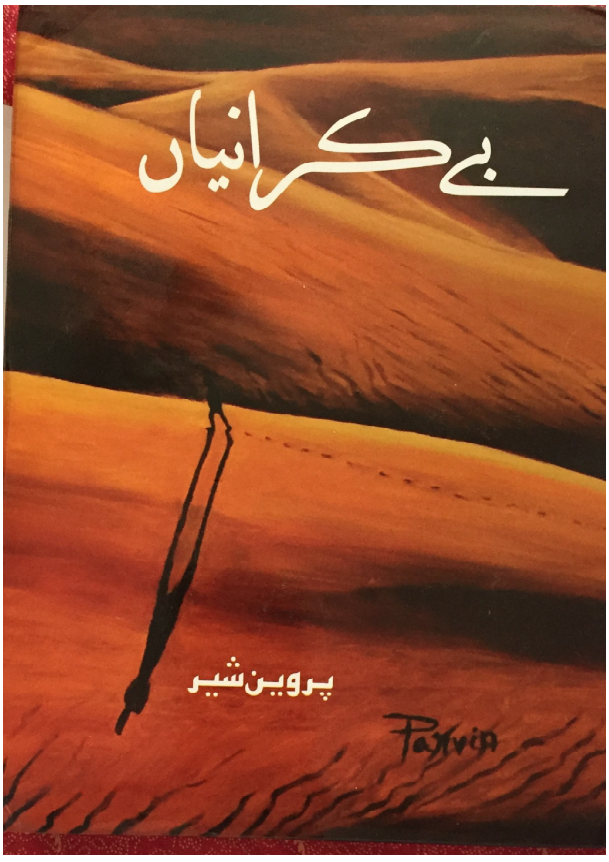

انٹرویو

ساقی فاروقی سے گفتگو

عارف:

میراجی اور راشد کے قبیلے میں اس وقت جو لوگ شعر لکھ رہے ہیں، ان میں میرے نزدیک آپ کا نام بہت اہم ہے۔ اور شاعروں سے آپ کو کس بنیاد پر الگ کیا جا سکتا ہے؟

ساقی:

''اہم'' کے لفظ پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ میں شاعر ضرور ہوں لیکن اہم ہرگز نہیں۔ شاید تم نے عمداً فیض کا نام نہیں لیا حالاں کہ جدید شاعری کو سمجھنے کے لیے ان تینوں پیش روؤں کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ان تینوں کو سمجھنے کے لیے ان کے پیش روؤں اقبالؔ اور اخترؔ شیرانی کو سمجھنا ضروری ہے۔

ادب سائنس نہیں ہے کہ ہر نیا خیال یا نظریہ پرانے خیال یا نظریے کو منسوخ کر دے۔ مثلاً جب یہ معلوم ہو گیا کہ زمین گول ہے تو اس ادراک کے یک سر معنی بدل گئے کہ زمین چوکور ہے۔ یعنی اس نئی دریافت سے پرانے خیال کی تنسیخ ہو گئی۔ مگر ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ پرانے ''کارواں'' کے ایک شمارے میں ڈاکٹر تاثیر نے بالکل ٹھیک لکھ تھا کہ ''ملٹن (John Milton: b:1608) سے شیکسپیئر (William Shakespear:b:1564) کو کوئی خطرہ نہیں''۔ ہر نیا لکھنے والا پرانی آواز کے سائے سائے سفر شروع کرتا ہے۔ پھر حسب استطاعت دھیرے دھیرے اپنی آواز الگ کر لیتا ہے۔

اب اگر تمہیں میری شاعری پیش روؤں سے الگ نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے یہاں اس نئے استعارے کو جنم دینے کی کوشش ملتی ہے جو صرف عہد کے آہنگ سے مستعار نہیں بلکہ جس میں میری ذات کا آہنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔

عارف:

ذات کے آہنگ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ وہ کیا عوامل اور وہ کون سے عناصر ہیں جو اس آہنگ کی تشکیل کرتے ہیں؟

ساقی:

سب سے پہلے تو یہ آگہی کہ آپ بھی دوسرے افراد کی طرح ایک فرد ہیں، نہ ان سے برتر نہ ان سے کم تر۔ پھر یہ آگہی کہ آپ برتر یا کم تر تو نہیں مگر ان سے مختلف ہیں۔ اب چوں کہ آپ کی شخصیت اور آپ کا زمانہ مختلف ہے اس لیے آپ کی آرزوئیں اور جستجوئیں مختلف ہوں گی اور ان کا اظہار بھی۔ یعنی آپ کے لفظوں کی نشست اور ان کا نغمہ مختلف ہوگا ورنہ آپ اگلوں کے کلیشے (Cliche) میں گم ہو جائیں گے۔

عارف:

ممکن ہو تو کسی تمثیل سے اس نکتے کی وضاحت کر دیجیے۔

ساقی:

میرؔ کے اس شعر کو لو

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

فرض کرو کہ میری محبوبہ بھی ایسی ہی ہو کہ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے کلی کم کم کھلنا سیکھے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی آنکھوں کا اثر میری ذات پر بھی ویسا ہی ہو جیسا میرؔ کی ذات پر ہوا تھا اس لیے کہ میں میرؔ نہیں ہوں۔ میری شخصیت کی ساخت پرداخت جدا ہے، میرا ذہن جدا ہے۔ میرا احساس جدا ہے کہ میرا زمانہ جدا

ہے۔اس لیے میرا پیرایہ اظہار جدا ہوگا، میرے الفاظ بھی جدا ہوں گے۔ پھر یہ شعر میرؔ کے شعور کا حصہ نہیں تھا بلکہ اس نے پہلی بار ان الفاظ میں ایک احساس کا اظہار کیا تھا۔لیکن میری مجبوری دہری ہے کہ یہ شعر میرے شعور کا حصہ بن چکا ہے۔ مجھے یہ ورثے میں ملا ہے۔اب اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان آنکھوں کا اثر میری ذات پر ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا میر کی ذات پر ہوا تھا (ناممکن..... ناممکن) تو بھی مجھے نئے الفاظ منتخب کرنے ہوں گے ورنہ میں کلیشے (Clinche) میں گم ہو جاؤں گا۔جستجو کی ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے۔

عارف:

شاعری ، محنت، مشق، وجدان وغیرہ کے مباحث پر آپ کی رائے کیا ہے؟

ساقی:

میری حقیر رائے میں ہر آدمی پٹنشیلی (Potentially) شاعر ہوتا ہے جس طرح ہر آدمی پٹنشیلی بڑھئی ہوتا ہے یا ڈاکٹر ہوتا ہے یا درزی ہوتا ہے یا انجینئر ہوتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ کروڑوں خلیوں سے بنے دماغ میں ایک آدھ خلیے کی کمی بیشی ہو، جیسے انگلیاں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں مگر شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔اگر میرے والدین غریب کسان ہوتے، مجھے اسکول یا کالج نہ بھیج پاتے تو میں ہندوستان یا پاکستان کے کسی گاؤں میں ہل چلا رہا ہوتا۔ یہ ایک معزز پیشہ ہے مگر اسے اختیار نہ کرنے پر میرا اختیار نہ ہوتا۔ میرؔ غالب، اور اقبال سے نابلد لاکھوں میر، غالب اور اقبال اس لیے ہل چلا رہے ہیں کہ انہیں وہ وسائل ہی نہیں ملے جن سے ان کے خوابیدہ ذہنوں کے جن انگڑائی لے کر بیدار ہوتے۔کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تعلیم و تربیت (حالت و ماحول) کے باعث پچھلے بیس پچیس سال میں کیسی کیسی شاعرات سامنے آئیں۔ ادا جعفری اور زہرا نگاہ تو پرانی ہوئیں مگر فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر جیسی لڑکیوں نے ہماری شاعری کو نیا ڈائمنشن (Dimension) دیا ہے۔آؤ ماتم کریں ان شاعرات کا یا ان نقش نگاروں کا جو ہماری دادیوں یا نانیوں یا ماؤں کے اندر گھٹ کر مر گئیں، جن کی جلا ہی نہ ہو سکی۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''وہ تو پیدائشی شاعر ہے یا جینیس (Genius) ہے''، تو ہم غیر دانستہ طور پر اس لگن، اس محنت، اس مطالعے اور سوچ بچار کی نفی کر رہے ہیں جس سے کسی شاعر یا جینیس (Genius) کا خمیر اٹھتا ہے اور شاید غیر دانستہ طور پر ہی اسے ان تمام افراد سے الگ یا بلند کر رہے ہیں جو اس کے ہم عصر ہیں اور جن کی تقدیر اور دکھ سکھ سے اسے بحث ہے۔ایک شاعر کو ایک حجام سے اس لیے تو جدا کیا جا سکتا ہے کہ ان کی حرفتیں جدا جدا ہیں مگر نہ تو وہ حجّام پیدا ہوا تھا اور نہ یہ شاعر۔ایک نے بالوں کا پیشہ اختیار کیا دوسرے نے خیالوں کا۔اور اس پیشہ اختیار کرنے کے پیچھے بھی دو مختلف افراد کے حالات اور ماحول کو دخل ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔مگر ایک آدھ خلیے کی کمی بیشی کے باعث کسی کو پیدائشی شاعر ماننے میں مجھے باک ہے۔

عارف:

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ مذہبی آدمی نہیں مگر یہ اقرار یا انکار آپ کی شاعری میں اس طرح نہیں ملتا جس طرح جوش یا راشد کے یہاں ملتا ہے یا وہ انکشاف جو بعد کے لوگوں کے یہاں ملتا ہے مثلاً ناصر کاظمی، انتظار حسین، سلیم احمد اور منیر نیازی کے یہاں۔

ساقی:

میرے بھائی میں ایک بہت چھوٹا آدمی ہوں، میرا

ایک چھوٹا سا ذہن ہے اور میں اپنے طور پر خدا اور کائنات کے مسائل پر غور وفکر کرتا رہتا ہوں اور حسب استطاعت مطالعہ بھی۔ جس طرح خدا تمہارا مسئلہ ہے میرا مسئلہ نہیں بنا۔ پھر اس مسئلے پر دنیا جہاں کے مفکر اور فلسفی بٹے ہوئے ہیں۔ میں کسی ایک گروہ یا دوسرے گروہ کے دلائل کی حتمیت یا قطعیت پر ایمان لا کے اپنے اوپر انکشاف کے دروازے کیوں بند کروں۔ برسوں پہلے میں نے لکھا تھا:

ع وہ خدا ہے تو میری روح میں اقرار کرے

جن لوگوں کے یہاں خدا کا اقرار ملتا ہے وہ مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے وہ لوگ جو منکر ہیں یا وہ لوگ جو شک کے پیچواں زینے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

اگر تم خدا کی اتھارٹی (Authority) سے کسی مروجہ فیشن (Fashion) کے سبب انکار کرنے لگو تو تم اپنے آپ سے جھوٹ بولو گے کہ خدا تمہاری سرشت میں ہے۔ اسی طرح اگر میں اپنے مذہبی دوستوں کی خوشنودی کے لیے خدا کا اقرار کرنے لگوں تو میں اپنے آپ سے جھوٹ بولوں گا کہ میں اس آن میں، اس گزرتے ہوئے لمحے میں ہر اتھارٹی (Authority) کے خلاف ہوں چاہے وہ اتھارٹی خدا ہی کی کیوں نہ ہو۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اور یہاں فکر کے ادنیٰ یا ارفع ہونے کی بحث نہیں، میری موت اس جوہر کی مکمل موت ہوگی جس کا نام ''میں'' ہے اور عدم تک کی مسافرت اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔

عارف:

محبت، خوف اور غصے سے ہوتے ہوئے آپ کی شاعری اب کس سمت پر جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں آپ پر جانوروں نے سخت حملہ کیا تھا..... مینڈک، سوّر، خرگوش، کتّے، بلّے وغیرہ۔ آخر ایسا کیوں، پھر جس طرح ''حسن کوزہ گر'' راشد صاحب تھے، کیا ''شیر امداد علی'' اور جان محمد جان'' آپ خود ہیں؟

ساقی:

میں کوشش کروں گا کہ سوال کے اس مثلث کے تینوں زاویوں پر روشنی ڈالوں۔

۱) محبت، خوف اور غصے سے ہوتے ہوئے میری شاعری پھر غصے، خوف اور محبت کی طرف لوٹ رہی ہے کہ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا راستہ ہے۔

۲) یہ کہنا غلط ہوگا کہ جانوروں نے اب مجھ پر حملہ کیا ہے۔ بلّیاں اور مینڈک وغیرہ مجھے ہمیشہ پریشان کرتے رہے ہیں مگر ان کی محبت اب شدت اختیار کر گئی ہے۔ اصل میں کائنات کو میں صرف انسان کی جاگیر نہیں سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ کائنات پر حیوانات، حشرات الارض اور نباتات کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا۔

پھر میری نظموں کے نباتات وحیوانات میری ذات کا حصہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک فرد ان کے رشتے سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سیدھی سادی اینمل پوئمس (Animal Poems) نہیں ہیں۔ میرے جانور، جارج آرول (George Orwell b:1908) کے جانوروں کی طرح انسانی یا سماجی شخصیت نہیں رکھتے یا میں ٹڈ ہیوز (Ted Huges: b.1930) کی طرح ڈیٹچ (Detatch) ہو کر ان کے بارے میں، ان پر ترس کھا کر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اس کامپلکس (Complex) عہد کے کامپلکس (Complex) مسائل کے ساتھ ان کے ساتھ شامل ہوں۔

عارف:

کیا آپ سوّر، مینڈک اور خرگوش والی نظموں کی بنیادی علامتوں کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں؟

ساقی:

نہیں۔اصل میں شاعر سے یہ سوال کرنا اس کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ جب آکسفورڈ (Oxford) کے طالب علموں نے ''ویسٹ لینڈ (The Waste Land) کی علامتوں کے بارے میں اشارے چاہے تھے تو الیٹ (Thomas Stearn Eliot: b.1888) نے کہا تھا، میں آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے جو کچھ اور جن الفاظ میں کہنا تھا میں اپنی نظم میں کہہ چکا ہوں۔ مجھے اپنا مافی الضمیر بتانے کے لیے دوسرے الفاظ آتے تو نظم دوسرے الفاظ میں لکھی گئی ہوتی'' اسی طرح امریکہ جاتے ہوئے جب شمس الرحمٰن فاروقی مجھ سے ملنے آئے تو میں نے انہیں اپنی تازہ نظم یہ کہہ کر سنائی کہ یہ اس معاشرے کے خلاف ہے جو اپنے بیماروں اور اپاہجوں کو عضوِ معطل کی طرح کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ نظم انہیں بہت پسند آئی مگر کہنے لگے یہ ترسیل اور تنہائی پر بھی ہے، رفاقت کی تلاش پر بھی ہے۔

عارف:

آپ ''شاہ صاحب اینڈ سنز'' کی بات کر رہے ہیں

ساقی:

ہاں..... ہوتا یہ ہے کہ نظموں کی علامتیں مختلف ذہنوں پر مختلف طریقوں سے کھلتی ہیں۔ یہی نہیں کسی اچھے فن پارے کی تعریف یہ ہے کہ وہ دروپدی کی ساڑی کی طرح کھلتا چلا جائے، ملک کی سرحد سے پرے، برّ اعظم کی سرحد سے پرے اور وقت کی سرحد سے پرے۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اس فن پارے (شعر، نظم، افسانہ، پینٹنگ (Painting) سمفنی (Symphony) وغیرہ کی بوتل میں فن کار نے کسی گزرتے ہوئے لمحے کے جن کو قید کر دیا ہو.....

عارف:

آپ نے میرے سوال کے تیسرے حصے کا جواب نہیں دیا۔ جس طرح راشد، حسن، کوزہ گر' تھے کیا ''شیر امداد علی'' اور ''جان محمد خان'' وغیرہ آپ خود ہیں''؟

ساقی:

راشد کی نظم آپ بیتی تو ہے ہی مگر کسی اچھی نظم کی طرح اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ''میں'' کے زینے سے ہوتی ہوئی ''آدمی'' کی بالکنی (Balcony) پر جا نکلتی ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ اس نظم میں ایک جنگ جاری ہے، فن، رزق اور عشق کے درمیان۔ شکست و فتح تو نصیبوں سے ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ پوری سچائی یا ممکن سچائی کے ساتھ اس جنگ کے مناظر دکھاتا جائے۔ اس کا المیہ یا رزمیہ لکھتا جائے جو اس کے اندر جاری ہے۔ ''جان محمد خان'' اور ''شیر امداد علی'' بھی آپ بیتی ہیں مگر ان نظموں کے ''میں'' کو ''آدمی'' اور آدمی کو ''انسان'' بنانے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا اس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔ ان نظموں پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور اس معرفہ کی تلاش مجھے ۱۹۲۰ء سے تھی جب میں نے الیٹ کی نظم، لو سانگ آف جے الفرڈ پروفراک (Love Song of J. Alfred Prufrock) پڑھی تھی۔ پھر 1964ء میں پونڈ (Ezra Pound: b.1885) کی نظم ''ہیو سِلوِن مَا بَر لے (Hughe Selwyn Mauberley)'' نے تلاش کی آگ کو اور تیز کر دیا۔ ''شیر امداد علی کا مینڈک'' میں نے غالباً جنوری 1975ء میں لکھی تھی۔ راشد اور عبداللہ حسین دونوں لندن ہی میں تھے۔ میں نے رات میں نظم ختم کی۔ مگر سنانے کی بے چینی ایسی تھی کہ صبح دفتر نہیں گیا اور دونوں کو فون کر کے اپنے یہاں دوپہر کے کھانے پر بلا لیا۔ راشد نظم سن کر عبداللہ سے کہنے لگے:

''واٹ اے ریمارک ایبل پوئم اینڈ واٹ اے

ریمارک ایبل ٹائٹل) ایکسی لینٹ (What a remarkable poem and what a remarkable title: excellent) میں نظم کی داد سے اتنا خوش نہیں ہوا جتنا عنوان کی داد پا کر۔ عجیب نظر تھی راشد صاحب کی بھی۔

عارف:

راشد کی رفاقت نے آپ کو کیا دیا؟

ساقی:

ان کا ایک احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ انہوں نے میرے اس خیال کو بڑی تقویت دی کہ مطالعہ، مشاہدہ اس وقت تک فائدہ نہیں پہنچا سکتے جب تک وہ آدمی میں اُتر کر ''نور'' نہ بن جائیں۔ انہوں نے سکھایا کہ ''فیض جاری'' کو ''جاری تر فیض'' کیوں کر بنایا جا سکتا ہے۔

میں بھی راشد کی طرح کلیشے (Cliche) کا سخت مخالف ہوں۔ اس لیے میں نے شعوری کوشش کی ہے کہ موضوعات کا انتخاب، الفاظ کی ترتیب، آہنگ کی تخلیق ایسی ہو کہ ان تینوں پیش روؤں کی مزید مشہوری میری شاعری کے سبب سے نہ ہو جو جدید شاعری کے امام ہیں۔ میری مراد میراجؔی، راشدؔ اور فیضؔ سے ہے۔ میں اپنی کامیابی یا ناکامی کی بات نہیں کر رہا۔ میری نظموں سے دوسرے شعرا یاد آئیں تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی، ان کے ساتھ بھی میرے ساتھ بھی۔

عارف:

آخر آخر میں ایک اور سوال۔ مغرب سے آپ کے ہاں رزسٹنس (Resistence) کے بجائے کمپر ومائز (Compromise) ہے۔ آپ نے اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی میں بھی مغربی فوجوں کے سامنے ایک طرح سے ٹوٹل سرنڈر (Total Surrneder) کیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ساقی:

اس سوال میں تمہاری زبان اس قدر آفینسیو (Offensive) ہے کہ ڈیفنس (Defence) کے علاوہ کوئی چارہ نہیں حالاں کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔

تم نے ایک ہی سانس میں پہلے میرے رویے کو ''سمجھوتے'' کا نام دیا مگر اس سے تمہاری تسکین نہیں ہوئی تو بعد میں اس کو ''مکمل اطاعت'' کر دیا۔ اصل میں تم ہی نہیں، ہماری ساری قوم جذباتی زبان اور جذباتی پتیرے۔ بازی کو پسند کرتی ہے۔ یو این او (UNO) کے جلسے میں منہ سے جھاگ اڑانا اور تقریر پھاڑنا بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

پہلے تو میری زندگی ہی کو لو۔ میرا لندن میں رہنا ویسا ہی ہے جیسا کسی پاکستانی یا ہندوستانی کا چین، جاپان یا دبئی میں رہنا سوائے اس کے کہ یہاں اظہار کی مکمل آزادی ہے جو مجھے پاکستان میں نصیب نہیں تھی۔ پھر کراچی میں میری غربت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مجھے اپنی بے حرمتی نظر آنے لگی تھی۔ میں فکر معاش میں تمام عمر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو مجھ پر رزق کا حلقہ تنگ کیا اور جب میں حصولِ رزق کے سلسلے میں یہاں بس گیا تو اب الزام یہ ہے کہ میں مغرب کا آدمی ہوں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

پھر مغرب میں رہنے سے آدمی مغرب کا نہیں ہو جاتا۔ اردو شاعری میری عظیم محبت ہے۔ کراچی، لاہور اور دلّی میرے خمیر میں ہیں۔ روح ہندو پاک میری ذات ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والے میری طاقت ہیں۔ میرے اثر و رسوخ کا دائرہ اردو کے اثر و رسوخ کے دائرے کے علاوہ نہیں۔ خود میری اپنی ساخت ایسی ہے کہ ہر نئی تبدیلی میں مجھے ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ دل کی موت سہی مگر ذہن کی زندگی بھی ہے۔ میں مکمل آزادی کا قائل

ہوں، ذہنی بھی اور جنسی بھی۔ میں بند نہیں ہوں، کہیں بھی نہیں۔ اب کے چھٹیوں میں ایک ساحل پر دوسرے مردوں عورتوں کے ساتھ میں بھی مادر زاد برہنہ گھومتا رہا۔ ہر تغیر کے لیے میرے یہاں قبولیت ہے۔ ردّعمل بھی ہوگا مگر بنیادی طور پر اشیا کے اندر اُتر کر انہیں دیکھنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ یعنی میں تماشائی نہیں بلکہ تماشے میں شامل ہوں۔

اب میں اپنی شاعری کی طرف آتا ہوں۔ میں کمزور آدمی نہیں ہوں کہ کسی نئے خیال یا نئے اسلوب سے خوف زدہ ہو جاؤں۔ اپنے ادب، اپنی مٹی اور اپنے کلچر میں میرے پاؤں مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بیرونی حملوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ شکایت ان سے کرو جو ہندوستان اور پاکستان میں بیٹھ کر اپنے کپڑے انگریز درزیوں سے سلواتے ہیں یا جو مغربی ادیبوں اور فلسفیوں کا ذکر اس شفقت سے کرتے ہیں کہ آدمی احساس کم تری میں مبتلا ہو جائے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں اردو اور صرف اردو کا شاعر ہوں حالاں کہ انگریزی میں بھی نظمیں لکھتا ہوں اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اپنی زبان کے سلسلے میں کسی احساس کم تری کا شکار نہیں ہوں۔ اگر میرے دم سے کوئی خفیف لرزش، کوئی تازہ جھونکا اردو شاعری میں آجائے تو میں اپنے کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ مگر سچی بات تو یہ ہے، اینڈ آئی مین اٹ (And I mean it) کہ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ یہ تو سفر کی ابتدا ہے۔ میں واقعی ایک بہت چھوٹا شاعر ہوں اور یہ ''ادراک'' مجھے ہر آن پریشان رکھتا ہے۔

عارف:

شکریہ!

ساقی:

میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

''خدا'' یہاں محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

سرخ گلاب اور بدر منیر سے ماخوذ (ساقی فاروقی مرحوم کو ایک خراجِ عقیدت۔ ادارہ)

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ ۹۵

مضمون

عبدالصمد کے نئے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا معروضی وتنقیدی جائزہ

علی احمد فاطمی

امریکی نقاد ایمرسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب میرے سامنے کسی نئی کتاب کے ضرورت سے زیادہ چرچے ہونے لگتے ہیں تو میں کوئی پرانی عمدہ کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہوں۔ راقم کو بھی ایمرسن کا یہ عمل بے حد موافق آتا ہے، خصوصاً جب میں حالیہ نقادوں کی تھیوریٹکل قسم کی غیر ضروری وغیر منطقی موشگافیوں سے پر طویل، بے رس مضامین کے عنوان سے ہی اوبنے لگتا ہوں اور منصوبہ بند طریقوں سے جدید تنقید کو موجودہ تخلیق سے ان کے کٹے ہوئے رشتوں کو دیکھتا ہوں۔ آج کی تخلیق سے متعلق آج کی تنقید کی مجرمانہ خاموشی دیکھتا ہوں تو افسردہ اور رنجیدہ ہوتا ہوں۔ ایسی صورت میں، میں بھی کسی پرانے، مضبوط اور دیانت دار فنکار و ناقد کی تحریریں پڑھنے لگتا ہوں جہاں سے مجھے نئی طاقت اور روشنی ملتی ہے۔ ابھی حال میں شائع ہوئی فکشن کی تنقید سے متعلق بعض کتابوں ومقالوں کے عنوانات نے ہی مجھے پریشان کر دیا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ مائیکرو فکشن، فلیش فکشن، نیو فکشن اور نہ جانے کتنے فکشن۔ فکشن کی سچائیاں، افسانے کی شعریات، صنفیات وغیرہ پر تو بڑے بزرگوں کی کتاب آ گئی ہے جو کبھی فکشن کی طرف سنجیدگی سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان عنوانات سے ہی پریشان ہو کر میں نے ''مضامین پریم چند'' کتاب نکالی اور وہ مضامین پڑھنے لگا جو ناول سے متعلق ہیں اور جو 1930ء کے بعد لکھے گئے۔ رسوائی کی حد تک مشہور پریم چند کی حقیقت نگاری کے بارے میں جب خود ان کے قلم سے لکھے یہ جملے پڑھے تو قدرے حیران ہوا، اور اطمینان بھی ہوا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

''ضرورت سے زیادہ حقیقت نگاری قاری کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔''

''حقیقت پسندی ہمیں قنوطی بنا دیتی ہے''۔

''قاری تھوڑی دیر کے لیے ایسی دنیا میں پہنچنا چاہتا ہے جہاں اسے ایسے پست اور ادنی ماحول سے نجات مل سکے''۔

یہ ٹکڑے میں نے ان کے مضمون ''ناول کا فن'' سے لیے ہیں، جسے پریم چند نے 1931ء میں لکھا تھا۔ جب ''گئودان'' اور ''میدانِ عمل'' کو چھوڑ کر کئی اور ناول غیر معمول طور پر مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے پاس مشاہدہ و تجربہ تھا، فکر و فن سے متعلق ایک واضح، روشن اور عمیق تصور تھا۔ انہوں نے دنیا کے بڑے فکشن کو پڑھ رکھا تھا۔

یہاں مجھے عبدالصمد کے نئے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ ناول اسی سال 2018ء شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ان کا دسواں ناول ہے (اگر ایک انگریزی ناول کو بھی شامل کر لیا جائے) اس سے قبل 2015ء میں ان کا ناول ''اجالوں کی سیاہی'' شائع ہوا، اور مقبول ہوا۔ محض دو ڈھائی سال کی قلیل مدت میں تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا ناول لکھنا شائع کرنا حیرت میں ڈالتا ہے اور مسرت سے بھی دوچار کرتا ہے۔

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ عبدالصمد کے اس ناول پر لکھنے کے لیے میں نے پریم چند کی تحریروں کو کیوں پیش کیا۔ اول تو یہ کہ پریم چند کے گہرے سماجی شعور اور ان کی دردمندی حقیقت نگاری کو اب ایک معتبر و مستحکم مقام مل چکا ہے اور عبدالصمد بھی اپنے عہد کا گہرا سماجی شور رکھتے ہیں، ان کے بیشتر ناول سماج اور سیاست کے سیاق وسباق میں ہی نظر آتے ہیں، اسی لیے میں عبدالصمد کی

حقیقت نگار یا ورسماجی شعور کو پریم چند کی روایت سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ پریم چند کے ذہن میں حقیقت اور سماج کے جو تصورات تھے وہ عبدالصمد کے یہاں کس ارتقائی شکل میں پائے جاتے ہیں اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور کردار نگاری کے تعلق سے بھی جو تصورات و خیالات پریم چند نے پیش کیے ہیں اسے بھی دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے بطور تمہید پریم چند کی یہ تحریریں نا مناسب نہ ہوں گی، ایسا میرا خیال ہے۔

ناول کا آغاز ہوتا ہے راشد نام کے ایک نوجوان کردار سے جو بظاہر بے چین و غیر مطمئن مزاج کا کردار ہے۔ جو بقول عبد الصمد ''ہر چیز اسے نامکمل لگتی تھی۔ اسے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا کہ کہیں کچھ کمی رہ گئی ہے''۔ کسی چیز کی کمی کا احساس رکھنا ایک صحت مند نظریہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس لمحہ انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے وہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس لیے عدم تکمیلیت ارتقا کا ابتدائی نکتہ ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ہمہ وقت بے چین رہنا، اضطرابی کیفیت سے دو چار رہنا کردار کے منفی احساسات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کا جواز ذات میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور کائنات میں بھی۔ اچھی بات یہ ہے کہ عبدالصمد اس کردار کی بے چینی و بے قراری کو راست طور پر سماج سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس سے کردار کو از خود وسعت ملتی ہے اور ناول کا کینوس بھی بڑا ہونے لگتا ہے۔ راشد کو ایک عارضی ٹیچر شپ ملتی ہے۔ وہ ٹیوشن بھی کرتا ہے۔ ایک دن پرنسپل نے منیجر کی لڑکی سے شادی کی تجویز رکھدی اور وعدہ کرلیا کہ اس فیصلہ سے ملازمت پختہ ہوجائے گی تو بے قرار راشد کو ایک نئی قسم کی بیزاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے درمیان میں پرنسپل کا کردار بڑا پروفیشنل اور دنیا دار سا لگتا ہے۔ جس کی اچھی پیش کش بلی کو تھیلے سے باہر نکالتی ہے اور ناول ہموار ہونے لگتا ہے۔ پرنسپل تو ہنرمندی کے ساتھ اپنی بات کہہ گئے لیکن کشمکش اور تذبذب میں ڈوبے کردار راشد کی زندگی میں تو ہلچل مچ گئی۔ یہ ہلچل اور اتھل پتھل اس لیے کہ راشد ابھی نوجوان ہے، معصوم ہے۔ پرنسپل کی طرح ابھی اس پر دنیا داری کی پرت نہیں چڑھی ہے۔ اس کے پاس کچھ اپنے خواب ہیں۔ بقول مصنف ''وہ خواب بہت دیکھتا تھا بلکہ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ خوابوں سے ہی عبارت تھا''۔ ایسے خواب آمیز کومل ذہن میں دنیا داری کی یہ تلخ حقیقت اسے متلاطم کر جاتی ہے۔ خواب اور حقیقت دونوں ہی اس کے سامنے برہنہ تھے اور پھر یہ برہنگی ایک سماجی حقیقت بن کر ابھرتی ہے جہاں عبدالصمد طبقاتی کشمکش کو ''فیل گڈ'' کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک نئی اصطلاح ہے ورنہ تراشیدم اور شکشتم کی روایت انسانی معاشرہ میں برسوں سے رہی ہے۔ خواب اور شکست خواب کے سلسلے نئے تو نہیں ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ نچلے متوسط طبقہ کے پاس اتنے خواب ہوتے ہی کہاں ہیں۔ تو پھر راشد کے پاس ہی کیوں؟ جب کہ اس کے والد راشد کو زیادہ پڑھانے کے حق میں نہیں تھے لیکن راشد اپنی ذات میں الگ تھا جس کو اس نے اپنی قوم سے بھی جوڑ رکھا تھا اور پھر مصنف کے یہ جملے جو ذرا مثالی سے لگتے ہیں لیکن کہانی کو ایک موڑ دینے کے لیے غالباً ضروری تھے۔ بہر حال جملے متاثر کرتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

> ''وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی پوری قوم کے سامنے بس یہی ایک راستہ بچا ہے، باقی سب راستے بند ہو چکے ہیں، قوم کے ساحل پر جو کشتیاں لنگر انداز رہا کرتی تھیں وہ کب کی جلائی جا چکیں، اگرچہ قوم ابھی تک بہت سے مفروضی راستوں کے بھرم میں مبتلا ہے، مگر راشد کو یقین تھا کہ جب علم کا دروازہ بہت روشن ہو جائے گا تو ان کی نگاہیں بھی صرف اور اسی

دروازے پر مرکوز ہو جائیں گی، سارے بھرم ان
کے دل سے نکل جائیں گے''۔

اسی جذبہ کے تحت اس نے مخالف ماحول میں بھی ایم اے کرلیا۔لیکن ایک جذبہ اور ہے اور وہ ہے جذبۂ محبت جس کا کوئی طبقہ نہیں ہوتا اور جس کے لیے کسی سند کی بھی ضرورت نیں۔اس کے لیے صرف دل گداختہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ایک خالہ زاد بہن آفرین کا کردار داخل ہوتا ہے اور عورت کے بغیر جب کائنات نامکمل ہے تو ناول کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔بچپن کا ساتھ، محبت کا ساز جوانی میں آواز دینے لگتا ہے۔بیلے کے پھول مہکنے لگتے ہیں۔ناول میں کچھ دیر رومان کی چاشنی گھلنے لگتی ہے۔لیکن راشد یہاں بھی کمزور، حساس اور پریشان۔آگ دونوں طرف یا ایک طرف اور پھر یہاں بھی ایک سماجی حقیقت کہ ابھی تو وہ کسی لائق ہی نہیں ہے۔ ماں باپ پر بوجھ بنا ہوا ہے۔حالاں کہ ایک نوجوان عاشق کا یہ احساس عجیب سا لگتا ہے کہ ''زندگی کی تلخ حقیقتوں کو جو جھتے وہ اچھی طرح سے واقف ہوگیا تھا کہ محاوروں کی زبان اور ہوتی ہے حقیقت کی کچھ اور محاورے میں آدھی آدھی روٹی ضرور کھائی جاسکتی ہے لیکن حقیقت میں.....؟'' لیکن ضرورت سے زیادہ حساس نوجوان کے یہاں شاید یہ ممکن ہو اس لیے راشد کے کردار میں سنجیدگی اور شفافیت سے مل جل کر بنی حسیت (Senseability) کی شناخت بنتی ہے ورنہ بے حس انسان کے لیے نہ آفرین مسئلہ ہے اور نہ پرنسپل۔راشد کو حساس دکھانا ناول نگاری کی مجبوری ہوسکتی ہے اس لیے کہ اسی حسیت کو تخلیقیت میں پیوست کر کے اس زاویہ سے وسعت دینی ہے جو ملک و ملت تک پھیل جائے اور پورے معاشرے کی بے حسی بھی سامنے آجائے۔نتیجتاً کردار کی حسیت اور معاشرہ کی بے حسی ایک معنی خیز تضاد پیدا کرتی ہے۔ ایک خوبصورت تخلیقی تضاد اور عمدہ ناول عموماً ایسے متعدد تضادات اور Paradaxes سے ہی آگے بڑھتا ہے۔یہاں بھی مجھے پریم چند کے جملے یاد آتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''کرداروں کی مشابہت اور اختلاف، یکسانیت میں تضاد اور تضاد میں یکسانیت دکھانا ناول نگار کا بنیادی فریضہ ہے''۔

اس کے بعد عبدالصمد کے یہ جملے دیکھئے:

''لڑکیاں عموماً کند ذہن ہوتی ہیں بلکہ یوں کہیے کہ ان کی ذہانت پوشیدہ رہتی ہے''۔

''بدصورت سے بدصورت لڑکی کار میں جاتے ہوئے خوبصورت نظر آتی ہے''۔

یہ تو کچھ ہلکے پھلکے تضادات ہیں لیکن راشد کی نظر میں زندگی کی حقیقت یہ ہے:

''یہ سب وقتی باتیں ہیں، وقت کی دھول ان پر پڑ جاتی ہے تو یہ دکھائی بھی نہیں پڑتیں، دکھائی دیتی ہیں صرف زندگی کی سچی اور تلخ حقیقتیں جو زندگی بھر آپ کا ساتھ دیتی ہیں''۔

زندگی کے یہ Paradaxes ناول کو بامعنی بناتے ہیں بشرطیکہ ناول کی تخلیقی فضا بالاتر رہے اس لیے کہ ناول پہلے ایک تخلیق ہے جو تخلیقی عمل سے گزرتا ہے، زندگی کی دستاویز بعد میں۔کرداروں کی نقل و حرکت، ان کے مکالمے، مکالموں کی ہلچل اور زندگی کی چہل پہل ناول میں روشنی بکھیرتی چلتی ہے۔کورا فلسفہ یا کوری حقیقت ناول کو بوجھل کردیتی ہے۔لارنس نے کبھی یہ ضرور کہا تھا کہ فکشن کی اعلیٰ ترین منزل اس کا فلسفہ بن جانا ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ فلسفہ کو اوپر تیر کر نہیں بلکہ تحلیل ہو کر تخلیق میں جذب و پیوست ہوجانا چاہیے۔یہ وہ نازک عمل ہے جس پر بڑے سے بڑے ناول نگار کمزوری کا شکار ہوجاتے ہیں خواہ وہ ''گئو دان'' ہو یا ''آگ کا دریا'' اب ایسے خاص ناولوں کے بارے میں عام رائے آچکی ہے کہ ان ناولوں کے وہ حصے غیر ضروری ہیں جہاں

فلسفہ، تاریخ، تہذیب وغیرہ پر طویل بحثیں ناول کا حصہ بنی ہوئی ہیں جو تخلیقی لطافت کو متاثر کرتی ہیں اور قرأت کے دلچسپ تسلسل میں رخنے ڈالتی ہیں۔ عبدالصمد کی تخلیقی ہوش مندی یہ تو ہے کہ وہ خود کم بولتے ہیں، کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ جستہ جستہ ٹکڑوں میں سادگی کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے چلے جاتے ہیں جو قرأت کی سطح پر ناگوار نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی ان کے یہاں بھی غیر فطری عمل در آتا ہے جو ناول کو متاثر کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حقیقت (Realism) اور آدرش (Idealism) کے تخلیقی انجذاب و امتزاج اور اس کے نازک فرق کو مکالماتی حقیقت کے ذریعہ کچھ اس طرح سادگی سے پیش کرتے ہیں کہ کبھی سادگی کا حسن ابھرتا ہے تو کبھی روایت کی کہنگی کا۔ کبھی یہی حسن بنتا ہے تو کبھی یہی کمزوری بھی بنتی ہے۔ یہ کمزوری بڑے بڑے فنکاروں کے یہاں مل جاتی ہے جس سے ان کی عظمت متاثر نہیں ہوتی کہ سانچے میں ڈھلا ہوا فن کس فنکار کے نصیب میں آیا ہے بہرحال، ان سب معمولی باتوں سے عبدالصمد کا مشن جو بڑا ہے اور جس پر وہ مسلسل مصرف ہیں وہ متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ چاہے تو کوئی ان سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس مشن کی سمت و رفتار کیا ہے اور کہاں تک ہے اور وہ صرف اقلیت تک ہی کیوں محدود ہے، وہ عالم انسانیت کی بیکراں فضاؤں میں پھیل کیوں نہیں جاتی۔ بہرحال یہ بھی ایک ضمنی سوال ہے لیکن ڈر ہے کہ یہی سوال آگے چل کر عبدالصمد کی ناول نگاری کے حوالے سے بنیادی سوال نہ بن جائے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے جو عبدالصمد کے حق میں جاتی ہے کہ وہ بات اقلیت کی ضرور کرتے ہیں لیکن سماج کی تکثیریت سے الگ نہیں ہوتے۔ مرکز میں خواہ کوئی بھی ہو لیکن ان کا سیاق و سباق سیاست اور معاشرت تک پھیل جاتا ہے۔ یہی عناصر ان کے ناول کے کینوس کو بڑا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ناول کامیاب بنتا ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے۔ پریم چند کے کچھ جملے یہاں بھی کام کے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''ناول اپدیشوں سے نہیں نصیحتوں سے بھی، بلکہ جذبات کو متحرک کر کے دل کے نازک ستاروں پر چوٹ لگا کر اور نیچر سے ہم آہنگی پیدا کر کے لکھے جاتے ہیں''۔

راشد کی سوچ میں حساسیت ہے جو درمیان میں کروٹ لیتی رہتی ہے تاریخ، تہذیب اور سیاست کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی سوچ اور مکالموں سے یہ حقیقت تو سامنے آتی ہے کہ ہمارے نوجوان، ان کا علم و شعور، ان کی صلاحیتوں، محنت و مشقت دوسروں ملکوں کے کام آرہی ہیں اپنے ملک میں نہیں۔ اس کی وجہ ہماری سماجی نظام ہے۔ راشد سنجیدہ اور شریف انسان ہے۔ اسے اپنے والدین کا خیال ہے اور تھوڑا بہت آفرین کا بھی اور پھر یہ بھی:

''جسے اپنی زمین نہیں پوچھتی وہی غیر کی آس لگائے بیٹھا ہے''

ایک تعلیمی ادارہ میں اساتذہ کی قسمیں، نوکری سے استعفیٰ ضمیر کی حفاظت، حال کی بہتری تو مستقبل کی فکر مندی، اکسپورٹ امپورٹ کی نوکری، درمیان میں آفرین کی آفرینی۔ ناول ترتیب و تجسیم کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ درمیان میں ایسے معنی خیز جملے بھی لطف دیتے ہیں:

''ناشتہ میں انڈے کا اضافہ ہو گیا تھا''

''مستقبل کا مقفل دروازہ حال کی مضبوط چابی سے ہی کھلتا ہے''

''خوشبوؤں اور رنگوں میں لپٹی سوچ اس کے اندر ایک برقی لہر دوڑا رہی تھی''

''زندگی کی کشتی ٹیڑھی میڑھی نالوں میں ہچکولے کھاتے ہوئے اپنی رفتار سے چلتی رہی''

''تجربہ کا ایک سمندر بھی ہوتا ہے اور ابھی اسے سمندر سے واسطہ نہیں پڑا تھا''

اور ناول سمندر میں غوطہ کھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ہچکولے کھاتے اس سماج میں صرف مسلمان ہی نہیں ہندو بھی رہتے ہیں، فرقہ پرست ہندو بھی۔ ایک فرم نے ایک خاص مذہب کے لوگوں کو ملازمت دینے سے انکار کر دیا اور راشد کی یہ فکرمندی۔ اس ٹینڈنسی کو فروغ نہیں دینا چاہیے، یہ ملک اور قوم کے لیے ہرگز بہتر نہیں ہوگا۔ لیکن ٹینڈنسی دہائیوں سے بڑھتی ہی چلی گئی جو ملک کے آئین کے خلاف ہے اور راشد کی طرح ہزاروں لاکھوں کو پریشان کرنے لگیں جو وطن کی محبت میں باہر نہیں گئے لیکن اندر والوں نے قدر نہیں کی، ملازمت کی حد تک نہیں، محبت کی حد تک اور اس کے آگے بہت آگے، دور وطن سے در، مجبور۔

باپ بیٹے کے درمیان معنی خیز مکالمے ہندوستان کے موجودہ معاشرے میں مسلم نوجوان کے منطقے کو پیش کرتے ہیں۔ موجودہ دور کی معاشی بدحالی، عدم تحفظ، آسودگی و عافیت کی تلاش، دو مذہب ہی نہیں دو نسل کے ٹکراؤ۔ غرض کہ سبھی کچھ، ایک نیا سماج ہی، ایک نیا احساس نامعوم انداز میں اُبھرتا چلا جاتا ہے۔

بیٹا باپ سے کہتا ہے ''ابا ہم منفی سوچ کو کیوں اپنائیں اس طرح تو یہاں کے نوجوان کچھ کر ہی نہیں سکیں گے''۔

باپ بیٹے سے کہتا ہے۔ ''دیکھو بیٹا جذباتی بننے سے کوئی فائدہ نہیں، عملی آدمی بنو، تب ہی دنیا میں ترقی کر سکو گے۔ دنیا کی ساری طاقت پیسے میں سمٹی ہوئی ہے''۔

بہ الفاظ دیگر غیر ضروری شرافت، ایمان داری، زمین سے محبت، انسانیت سے کام چلنے والا نہیں، حادثات و تجربات سے بھری باپ کی اس سوچ نے بیٹے کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور پھر یہ بھی سوچنے بلکہ کہنے پر مجبور کر دیا ''ٹھیک ہے ابا آپ جیسا کہیں!''

لیاقت اور شرافت اور زندگی کی عملیت ناول کے پلاٹ کو ہی نہیں راشد کی زندگی کے پلاٹ کو بدل کر رکھ دیتی ہے اور راشد صرف ایک نوجوان ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں لاکھوں نوجوانوں کی علامت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زمین کی محبت سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے زن کی محبت۔ وہ پرائیوٹ ملازمت کو چھوڑ دے لیکن حقیقی محبت یعنی آفرین کو کیسے چھوڑے۔ منٹو نے اپنے افسان ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں یہی سوال قایم کیا ہے کہ اگر ملک واقعی تقسیم ہو گیا تو اس کی محبوبہ، اس کی نوکری، گھر بار کا کیا ہوگا۔ یہاں معاملہ آفرین کا ہے لیکن اپنی زمین کا بھی ہے، اپنے مستقبل کا بھی جو وقتی ملازمت اور دولت سے تو حل نہیں ہو سکتا۔ بزرگ لوگ کہتے آئے ہیں کہ جو وطن سے نکل گیا کامیاب ہوا۔ دوسروں کی زمین وطن ثانی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب یہ کہانی پرانی ہو چکی ہے۔ آج کی صارفی دنیا میں بازار واد میں، دولت کی ریل پیل، بے خوف جھوٹ اور بے ایمانی کے سیلاب میں جب آپ کا وطن آپ کا نہیں ہے تو پھر یہ جہان تیرا ہے نہ میرا، جو جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔ غالباً یہی ناول کا مرکزی خیال ہے جسے عبد الصمد نے بڑے سلیقے سے سوال و جواب مکالموں و مجادلوں کے درمیان ناول کا ایک ایسا راستہ چنا ہے جو آج کا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر تخلیق لمحہ موجود کی کہانی ہوتی ہے اور حقیقت ہوتی ہے، جسے راشد جیسا سنجیدہ، غور و فکر میں ڈوبا کردار دور تک لے جاتا ہے اور سامنے کے حالات سے دور کے سوالات جنم لیتے ہیں۔ یہ جملہ دیکھئے:

''سارے سوالوں کے ساتھ ایک سوال تیر کی طرح اس کے احساس پر آ گرا۔ اتنے دنوں تک وہ اپنے گھر میں سونے کی دیوار تعمیر کرنے میں لگا رہے اور جب واپس آئے تو اس کی نگاہوں کے سامنے دیوار تاش کے پتے کی طرح ڈھ جائے اور تلخ حقیقت

اس کے سامنے یوں آ کھڑی ہو کہ وہ بھاگ کر بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ سمندر اور گہرا ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس میں ڈوبتا جا رہا تھا''

غیر سنجیدہ و بے حس انسانوں کے لیے کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسائل وہیں جنم لیتے ہیں، پریشانیاں اور غوطہ زنی وہیں ہوتی ہے جہاں حساسیت ہوتی ہے، دور اندیشی ہوتی ہے اور صادق جذبات ہوتے ہیں جیسا کہ راشد کے یہاں ہے اور ایک کردار فرم کے منیجر کا ہے۔ تجارت وصنعت کی پرائیوٹ فرم جس کا نتیجہ نہ وہ سچی باتیں کرتا ہے بلکہ اس کے جملوں سے آج کی معیشت اور صارفی معاشرت پر اچھی روشنی پڑتی ہے:

''ہماری جیسی فرم میں اپنے سامنے صرف منافع کا ہدف رکھتی ہیں، اس ہدف سے وہ ایک انچ آگے جا سکتی ہیں نہ پیچھے۔ وہ نہ رشتہ دیکھتی ہیں نہ تعلق۔ ان کے سامنے صرف اور صرف پیسہ ہوتا ہے اور پیسے کو رگڑ کر جو اسے چمکا دے وہ ان کا پیارا ہو جاتا ہے''۔

یہ معاملہ اب صرف فرموں تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے سماج میں، خاندان میں، رشتوں میں پھیل چکا ہے۔ چاروں طرف صارفیت ومنفعت کا کھیل ہے اس پر فرقہ واریت کا تڑکا۔ رام گڑھ کے بلاسٹ کا حادثہ ناول کو ایک اور رخ دیتا ہے جو آج کا ہے، آج کے مسلم نوجوانوں کا بطور خاص۔ حادثہ کی سنگینی اور نوکری سے برطرفی راشد کی سنجیدگی اور ایمانداری کو متزلزل کر دیتی ہے اور بقول مصنف۔ ''زندگی کے راستے میں اتنے ہچکولے تھے کہ اسے اپنے قدموں کا توازن برقرار رکھنا بہت مشکل ہو گیا تھا''۔ لیکن راشد کی سوچ میں حق اور ایمان کی ابھی بھی اتنی طاقت باقی تھی کہ اس کی ہمت شکستہ نہ ہوئی تھی۔ یہ شاید ناول میں ہو۔ ایسا ضروری بھی ہوتا ہے کہ ناول کے کردار حقیقی کرداروں سے بہر حال مختلف ہوا کرتے ہیں۔ انہیں قدرے مختلف اس لیے بھی کہا جاتا ہے بقول پریم چند:

''جن مکر وفریب کی دنیام میں وہ سانس لیتا ہے اس کی دوبارہ تخلیق اسے محفوظ نہیں کرتی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ ایسی دنیا میں پہنچنا چاہتا ہے جہاں اسے ایسے پست اور ادنیٰ ماحول سے نجات مل سکے''۔

شادی اسی اختلاف کی وجہ سے راشد باہر جانے کے بجائے ٹیوشن کا نیا سلسلہ شروع کرتا ہے جواب کاروبار بن چکا ہے، لیکن راشد کاروبار کیسے کرے وہ بھی بے حس و بے جان کرداروں کے ساتھ جس نے علم حاصل کرنے کے سارے دروازے بند کر رکھے ہوں۔ کبھی بیٹا مایوس تو باپ سہارا بنتا ہے اور کبھی باپ مایوس تو بیٹا سنبھالتا ہے اور ناول اس کراس (Cross) سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

بگڑی ہوئی قوم کی بگڑی ہوئی تصویر اور تقدیر۔ ان تصویروں میں ہزار یکسانیت ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد نے ان تصویروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے ہر رنگ و روغن کو سمجھا ہے، اس کی پرتوں کو کھنگالا ہے اور ان کے تلخ حقائق کو فسانوں میں ڈھالا ہے۔ گومگو، کشمکش، یاس وامید کی کیفیت یہاں صرف ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے قوم کی ہے۔ یہاں فرد کی داخلیت نہیں، افراد اقوام کی خارجیت ہے۔ ذات کی محدودیت نہیں، سماج کی لامحدودیت ہے جو محدودیت داخلیت اور عذاب بن کر راشد کے سامنے آتی ہے لیکن راشد تعلیم کے ذریعہ اس گھاؤ پر مرہم رکھتا ہے کہتا ہے:

''اور ہمارے پاس ہے بھی کیا، سوائے تعلیم کے، سو ہم اس کو بھی چھوڑ دیں''

''اب تو سمندر اور جنگلوں میں بھی ہمارے لیے جگہ نہیں بچی''

مذہب اسلام میں اس سے زیادہ تعلیم پر زور، خدا اور

اس کے رسول نے تعلیم پر زور دیا۔ صدیوں کے سفر میں اولیاء انبیاء، دانشوران، مصلحین، سرسید، حالی، اقبال آزاد، سبھی تعلیم پر زور دیتے رہے لیکن آج یہی قوم تعلیم سے دور ہے۔ کبھی نیل سے لے کر کاشغر تک سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور اب سمندر اور جنگلوں میں ہمارے لیے جگہ نہیں ہے۔ بے حد معنی خیز ہے، فکر انگیز ہے اور عبرت آمیز بھی۔ اس سے زیادہ طلبا کے یہ جملے:

''سر ہم تو اپنے بچپن ہی میں جوان ہو گئے اور نوجوانی میں بوڑھے۔ اتنی ہی عمر میں ہم نے دنیا دیکھ لی۔ اب کسی بات کا ہم پر اثر نہیں ہوتا۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہزار محنت کر کے، پڑھ لکھ کے بھی ہم وہیں رہیں گے جہاں ابھی ہیں''۔

یہ ایک نوجوان نہیں پوری نسل سوچ رہی ہے۔ نسل کی یہ نفسیات دہائیوں کے تجربات، حادثات، عصبیت اور نفرت سے جنمے ہیں، اسی کو پیش کرتے ہیں عبدالصمد جس میں ان کی دردمندی و ہوش مندی تو ظاہر ہوتی لیکن کبھی کبھی ہنرمندی متاثر ہوتی ہے اس لیے عصبیت نفرت با آسانی تخلیقیت کا حصہ کم کم ہو پاتی ہے۔ تخلیقیت کی لطافت اور نزاکت نرم و نازک موضوعات کو زیادہ موافق آتی ہے اور عبدالصمد کے ناولوں کے موضوعات عموماً سیاسی، سماجی اور اقلیتی ہوتے ہیں جہاں راست اور لاوڈ ہونا ان کی کم موضوع کی مجبوری ہو جایا کرتی ہے مثلاً راشد کا ضرورت سے زیادہ آئیڈ یلزم اور بہکے ہوئے بچوں کا راشد سے مکالمہ کبھی کبھی غیر فطری سے لگنے لگتے ہیں۔ لیکن ایسے قیمتی جملے ناول کی فضا کو قایم رکھتے ہیں:

''بیٹھ جانے کا مطلب ہے کہ ہم اپنے آپ کو کوڑے میں تبدیل کر دیں''

''گارجین تو یوں گئے جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے جا رہے ہوں''

تعلیم گاہ پر پولیس کا حملہ ایک بار پھر آئیڈ یلزم کو ریلزم میں بدل دیتا ہے اور پولیس کا یہ جملہ:

''کارآمد بنا رہے ہیں یا سماج کو برباد کر رہے ہیں''

پولیس کی کرختگی، بیجا سختی راشد کے تمام آدرش کو مسمار کر دیتی ہے۔ نیز طلبا کی بے راہ روی، اسمارٹ فون کی شرم ساری مزید راشد کو پریشانی میں ڈالتی ہے بلکہ بقول مصنف اس کی دھمک ہڈیوں تک سرایت کر جاتی ہے اور راشد ایک بار پھر دوراہے پر۔ یہی سمجھ اور نا سمجھ، ہمت اور پست ہمتی، امید اور ناامیدی نہ صرف پورے ناول بلکہ پورے قوم کی ہے۔ یہی اس ناول کا مرکزی کردار نہ سہی مرکزی خیال ضرور ہے۔ ناول اس مقام پر ختم ہو سکتا تھا لیکن ناول کو تو اور آگے جانا ہے اس لیے کہ قوم اور اس کے مسائل بھی اس کے آگے جا چکے ہیں۔ پھر دنیا ایک گلوبل ولیج (Global Village) بن چکی ہے۔ دنیا اب بہت بڑی یا پوشیدہ نہیں رہ گئی ہے۔ گرد و غبار، تکلیف و آزار سے بھرے اس دھندلے ماحول سے آفرین کا کردار غائب ہی رہتا ہے۔ حالات راشد کو عالمی دروازوں کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور ناول اس مقام پر ایک اور کروٹ لیتا ہے اور وہ احساسات در آتے ہیں جو ملک اور بیرون ملک کی کشاکش اور بے وطنی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور پھر ناول باہر جانے کے اسباب میں گم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آفرین کا دھندلا سا چہرہ ابھرتا ہے، روکھی پھیکی زندگی میں خوشبو کا ایک جھونکا، ناول کا قصہ اور قارئین کا جذبہ اور پھر یہ روایتی جملہ:

''میں باہر جا رہا ہوں، بہت دنوں کے لیے، میرا انتظار کروگی''

ولایتی ماموں، دیسی مرغ، سیخ کباب، رسیاول، بہاری بریانی، پردیس میں دیس کی یاد اور دیس سے پردیس جانے کی تیاری، ایک

کراس پھر پھر نائن الیون، دہشت گردی، زمین کی تنگی، کشتیوں کا جل جانا، بے بسی اور دوسری طرف امریکی ماموں کے یہ جملے:

''تم دنیا کے ہر کونے میں جاؤ خوب دنیا دیکھو مگر اپنی زمین کو کبھی مت چھوڑو، جو ایک بار اپنی زمین چھوڑ دیتا ہے اسے پھر زمین قبول نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وطن کی دو سوکھی روٹیاں غیر وطن کے مکھن سے چپڑی ہوئی روٹیوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں''

ایک اور تضاد لیکن ناول تو تضاد سے ہی ابھرتا ہے۔ مایوسی در مایوسی، باہر کے ملکوں میں اب جگہ نہیں، اجازت بھی نہیں، اپنے ملک کے زمین تنگ ہوگئی ہے۔ ''خدا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔'' اور یہ قیمتی جملہ:

''آدمی جب اپنا اعتماد کھو دیتا ہے تو اسے ہر چیز میں کھوٹ نظر آنے لگتا ہے''

بہر حال، ایک معجزے کی طرح راشد امریکہ کا سفر کرتا ہے۔ ناول یہاں بھی ختم ہوسکتا تھا لیکن یہاں سے ایک اور باب شروع ہوتا ہے۔ امریکہ کا شہر شکاگو اور یہاں بسے اس کے قدیر ماموں اور یہ جملے:

''آسمان وہی تھا اگر چہ بہت پھیلا ہوا تھا، زمین وہی تھی اگر چہ بہت وسیع تھی، فضا ہوا بھی وہی تھی''۔

لیکن راشد پر اجنبیت کی چبھن تھی اور قدیر ماموں کہہ رہے تھے:

''میاں یہاں ٹوائلٹ بھی خود ہی صاف کرنا پڑتا ہے۔ یہاں کوئی خادم نہیں ملتا۔ محنت کی Dignity یہیں تو دیکھنے کو ملتی ہے۔''

قدیر ماموں کا یہ جملہ بھی غور طلب ہے:

''یہاں ہر ہندوستانی گھر کے اندر ہندوستان اور ہر پاکستانی گھر کے اندر پاکستان بلکہ دونوں کا موازنہ کیا جائے تو صرف طغروں کے فرق سے دونوں ملکوں کی پہچان ہوتی ہے البتہ ہمارے گھروں کے باہر ہر قدم پر بہت شدت کے ساتھ امریکہ موجود ہے''۔

ایک جملہ یہ بھی ''یہاں مشین مل جاتی ہے آدمی نہیں ملتا''

لیکن قدیر ماموں کے پوتوں کا غالب پڑھنے کے لیے کہنا اور بعض دوسروں کا ہندوستان کے سماجی حالات کا جاننا کچھ کچھ غیر فطری تو کم غیر تخلیقی زیادہ لگتا ہے اور ناول بھی کسی امریکی شوپیس کی طرح جگمگاتا تو ہے لیکن روح غائب سی ہو جاتی ہے۔ ہر طرح کے عیش و آرام اور سہولتوں کے باوجود اب لگتا ہے کہ نگاہیں واچ کر رہی ہیں، کیمرے لگے ہوئے ہیں، پولیس والے تعینات ہیں۔ تین ماہ کی ٹریننگ، مستقبل قیام کی فکر ناول کو آگے بڑھاتی ہے۔ ناول کے اس حصہ میں جس قدر معاون کردار ماموں کا ہوتا ہے اس سے زیادہ حیران کن کردار ان کی اہلیہ کا جسے ماموں نے پاگل مشہور کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ ہمہ وقت کمرے میں قید رہتی ہے۔ پاگل بیوی، بوڑھے ماں باپ، مہمان امریکی طرز معاشرت میں عضو معطل ہیں جنہیں ڈسٹ بن میں پھینک دینا چاہیے۔ اس مقام پر ناول طرز معاشرت پر دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ وہ پاگل خاتون ایک زمانے میں بیحد سوشیل رہی تھیں سیر و تفریح کرتی رہی تھیں، آج وہ قید میں ہیں۔ زندگی کا یہ تضاد بھی امریکہ جیسے بڑے ملک میں دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ مشرق میں بیوی تو کیا والدین کے علاوہ دادی، نانی وغیرہ کو ہم آج بھی عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔ تہذیب کا یہ کراس بھی ترقی یافتہ زندگی کی ایسی دین ہے جسے اقدار کی گمشدگی کہیں یا ترقی کی روشنی، یہ کشمکش تو ہر ملک میں ہے بس ذرا شکلیں مختلف ہیں۔ اس مقام پر قدیر ماموں کا متضاد کردار متوجہ کرتا ہے، جو مشرقی اقدار پر جان دیتا ہے اور رفیقہ حیات کو پاگل قرار دے کر قید میں رکھتا ہے، جنہوں نے قدیر

صاحب کو امریکہ بلایا تھا، جو اردو، کرتا پاجامہ پسند کرتا ہے لیکن خود مغربی طرز میں ڈھلا ہوا ہے، جس کے پوتے تو مسجد جاتے ہیں اور وہ خود شراب پیتے ہیں اور کلب جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بیٹھے قدیر ماموں کو خوشحال اور خوش مزاج سمجھنے والے ہندوستانی کیا جانیں کہ امریکہ میں وہ کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ ایک طرف یہ، دوسری طرف امریکہ میں مسجدوں کا نمازیوں سے بھرا ہونا، اپنے مذہب اور تہذیب کا گرویدہ ہونا اور اسے قایم رکھنا، اس کی حفاظت کرنا، وطن کی خیر خواہی کرنا وغیرہ اور امریکہ میں رہتے ہوئے اس احساس سے دوچار ہونا:

''اس وقت ہم سب پر آزمائش کا وقت آ پڑا ہے ہم چاروں طرف ایک گھیرے میں ہیں اور ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے آس پاس جو ہیں وہ واقعی اپنے ہیں یا اپنوں کے بھیس میں کوئی اور.....''

اور پھر اسلام پر پڑے وقت کا اظہار اور آزاد ہندوستان میں جو گرم ہوائیں چل رہی ہیں وہ دراصل ہمارے گناہ ہیں امریکہ میں بھی خوف ہے، شبہات ہیں اور امریکہ سے متعلق یہ جملہ:

''آپ سمجھ لیجئے کہ پوری قوم غصے میں ہے مگر بحیثیت قوم وہ اپنے غصہ پر قابو رکھنا بھی جانتی ہے۔ اکثریت امن چاہتی ہے''

اور ایک یہ حقیقت بھی:

''یہاں ہم ایک طرح سے مہمان ہیں۔ قانونی حیثیت کھو جانے سے بنیادیں جڑیں مضبوط نہیں ہو جاتیں۔ وہاں ہزار کچھ ہو جائے کوئی آپ کو ملک سے نکال نہیں سکتا۔ یہاں اسی قسم کے کسی ملک میں اسی کا خطرہ بنا رہتا ہے.... اس ملک میں سوئی بھی گر جاتی ہے تو اس کی آواز اونچے ایوانوں میں سنی جاتی ہے''

ٹریننگ، ملازمت ، ہندوستان، پاکستان، ایک دوسرے کے حالات کی تفتیش، ایک عجیب سا احساس جسے اس نے سوشیل میڈیا کا حصہ سمجھا۔ امریکہ دنیا کا سب سے بڑا طاقتور ملک ہے پھر بھی عدم تحفظ کا شکار۔ ان کی سوچ میں یوٹرن آیا ہے اور امریکی مسلمان یہ سوچتے ہیں:

''یہاں کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ اس میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی بنیادوں کا احساس ہوتا اور ہم اپنی عاقبت سنوانے کی فکر کی طرف متوجہ بھی ہوتے، وہ تو سمجھئے کہ نائن الیون ایک Blessing in Disgaise کی شکل میں ہمارے سامنے آ گیا''۔

سوالات اور مکالمات سے امریکی سماج کی نئی سوچ پر روشنی پڑتی ہے جو معلوماتی تو ہے لیکن ناول میکانیکی صورت میں تبدیل ہونے لگتا ہے، ناول کم سماجی دستاویز زیادہ لگنے لگتا ہے یہ الگ بات ہے کہ عبدالصمد نے اسے مکالماتی انداز میں پیش کیا ہے جس سے قدرے دلچسپی بنی رہتی ہے۔ بے وطنی، دربدری، مذہبی بیداری، تہذیب کی رسی، کلچر کی روشنی، اس کے باوجود اندھیرا اور اندھیرے میں خدا کی روشنی۔

راشد کا دو سال کا امریکہ کا قیام۔ ابتدا شوق اور اب شوق کا بھرم کھل چکا تھا، اس سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ جو ہندوستانی، پاکستانی امریکہ میں رہ رہے ہیں وہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح ہیں، ہیں وہ ٹاٹ لیکن مخمل سے جڑ کر اپنے آپ کو مخمل ہی سمجھنے لگے ہیں، اگرچہ مخمل آج بھی انھیں ٹاٹ ہی سمجھتا ہے۔ اس مقام پر مکالمے ہی مکالمے ہیں۔ ان میں ایک باضمیر پروفیسر بھی ہے جو بڑے تیکھے تبصرے کرتا ہے چند مکالمے دیکھئے:

''تم مسلمان کسی عقیدے کو مانتے ہو، کس کو نہیں مانتے۔ کوئی ایک چیز مانتا ہے کوئی اس چیز کو نہیں مانتا، کبھی کبھی دوسرا آدمی چکرا کے رہ جاتا ہے''۔

یا

''مجھے مسلمانوں کے بارے میں سوچ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اتنا شاندار ماضی ہو، جس کے پاس اک زندہ تابندہ مذہب ہو، جس کے پاس اس کے رسولؐ کا اسوہ حسنہ ہو، جس کے پاس قرآن شریف جیسی بے پایاں روشنی ہو، جس کی دنیا میں قابل لحاظ آبادی ہو، وہ قوم دنیا میں اس قدر بکھری ہوئی اور ذلیل وخوار ہو، بہت افسوس کی بات ہے''۔

دو سال کی مدت پوری ہوتی ہے وطن واپسی کے دن آتے ہیں اور ناول کے خاتمہ کے بھی لمحات۔ اسے امریکہ جا کر بھی اپنے والدین کا سخت خیال تھا، عقیدت تھی، آفرین سے محبت تھی ورنہ امریکہ جیسے شاندار اور عیش وعشرت سے بھرے ملک میں کون کس کو یاد رکھتا ہے، لیکن یہ راشد کا مضبوط کردار ہی تھا جو آخر آخر تک بقول مصنف:

''اس کی ذہنی ساخت کی تعمیر کچھ ایسی ہوئی تھی کہ وہ ہر شر میں خیر کا ایک پہلو ضرور ڈھونڈ لیتا۔ ایک ذرا سی سوچ بدلنے سے اس کا سفر دنیاوی پٹری سے اُتر کر روحانی پٹری پر آجاتا تھا، جس سے اس کو مادی نقصان تو ہوتا مگر دل میں سکون کی ایک لہر بھی بیدار ہو جاتی جو اس کو بہت طاقت فراہم کرتی اور وہ سب کچھ بھول کر اپنے روحانی مقصد کی طرف رواں دواں ہو جاتا''۔

بظاہر ضرورت سے زیادہ کردار کی مضبوطی حیرت میں ضرور ڈالتی ہے لیکن مسلمانوں کی تمام تر کمزوریوں میں راشد کا کردار ایک کرن بن کر جگمگاتا ہے۔ بظاہر کردار کا یہ آدرش مصنوعی سا لگتا ہے لیکن ناول کے کچھ کردار زندگی کے حقیقی کرداروں سے بہر حال مختلف ہوتے ہیں اور انہیں ہونا بھی چاہیے۔ اس خیال کے تحت راشد کا کردار تقویت پہنچاتا ہے اور آج کے صارفی دور میں بازارواد کی اندھی چمک میں ایک منیارہ نور کی طرح کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس کردار کی مضبوطی ہے ورنہ کچھ لوگ اس کے غیر فطری رویے سے اس کی کمزوری تلاش کر سکتے ہیں۔

ناول کے آخر میں مصنف ایک سوال ابھارا ہے کہ امریکہ کے اس مدت قیام میں راشد نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ بظاہر یہ سوال بھی بڑا روایتی سا ہے جو پریم چند کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن آفرین کا کردار کرشن چندر کی یاد دلاتا ہے۔ دربدری ہجرت کے مسائل پر کہیں کہیں وہ انتظار حسین کے قریب بھی پہنچتے ہیں۔ اپنی روایتوں اور حکایتوں کے ان عظیم فنکاروں کے آمیزہ سے عبدالصمد جب خود تیار ہوتے ہیں تو ایک نئے عہد کا رزمیہ قاری کو چکا چوند کر جاتا ہے جو نئے فنکار اور اس کا مقدر ہے۔ اس ناول میں ایک قوم کا رزمیہ مشرق سے مغرب تک پھیل جاتا ہے جو عبدالصمد کے سابقہ ناولوں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ آگے کی منزل ہے۔ راشد کا کردار پوری حفاظت کے ساتھ وطن واپس آجاتا ہے لیکن پروفیسر کا انتقال ہو جاتا ہے اور ناول اس جملہ پر ختم ہو جاتا ہے:

''بے ساختہ اس کے تصور میں ایک بڑا سوالیہ نشان ابھر آیا جس کے اطراف میں امریکہ اور ہندوستان کے نقشے تھے اور سوالیہ نشان سے نکلتی ہوئی روشنی دونوں پر پڑ رہی تھی۔ اس نے سوچا بیشک روشنی کو محدود نہیں کیا جا سکتا''۔

پورا ناول راشد کے کردار کے اردگرد گزرتا ہے۔ تنہا ایک کردار مشرق اور مغرب کے مسلمانوں کو کور کرتا ہے۔ حالاں کہ اس میں اس کے والد، پرنسپل، منیجر، ماموں، آفرین درمیان میں آتے ہیں جو فضا سازی اور کردار سازی میں معاونت کرتے ہیں تاہم سوال یہ ہے کہ ناول میں کردار کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے یا کردار محض میڈیم ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کٹھ پتلی جن کے ذریعہ حالات، حادثات، معاشرت اور ثقافت کا خلاقانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہہ پانا تو مشکل ہے، یہاں بھی ہم پریم چند کی تحریروں کا سہارا لیں گے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں ناول کو انسانی کرداروں کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے''

اس اعتبار سے راشد کا کردار شفاف (Transparent) ہے بلکہ سادہ اور سپاٹ، اس میں اسرار و تجسس والی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اس میں آدرش ضرور ہیں، جدوجہد کا ایماندارانہ جذبہ بھی ہے لیکن صاف ستھرا اور یک طرفہ ہونے کی وجہ سے وہ کردار سادہ سا بن کر رہ جاتا ہے۔ شاید اسی لیے پریم چند کرداروں کو بجنسہ پیش کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی ہماری کمزوریوں اور بے راہ رویوں کی تصویر ہوتی ہے اور اس طرح کوری حقیقت پسندی ہمیں قنوطی بناتی ہے۔ آگے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ حقیقت نگاری عذاب بن جاتی ہے۔ جس مکروفریب کی دنیا میں قاری سانس لیتا ہے اس کی دوبارہ تخلیق اسے محظوظ کرتی تھوڑی دیر کے لیے وہ ایسی دنیا میں پہنچنا چاہتا ہے جہاں اسے ایسے پست و ادنیٰ ماحول سے نجات مل سکے، اس لیے جسے مدتوں آدرش واد کہا گیا دراصل وہ فنکار کا تصور و تخیل ہے جہاں انسان ایک اعلیٰ مثالی سماج کا خواب دیکھتا ہے۔ خواب دیکھنا ضروری ہوتا ہے جو راشد دیکھتا ہے اور اس سے زیادہ اس کے والد اسے دکھاتے ہیں، اس کے ٹوٹتے ہوئے خواب کو جوڑتے ہیں۔ خواب کا تعلق حقیقت سے بھی ہونا چاہیے ورنہ کردار پتھر کی مورت بن کر رہ جائیں گے۔ کسی مورت کی تصویر کشی مشکل نہیں اس سے زیادہ مشکل ہے اس میں انسانی روح پھونکنا۔ پریم چند نے یہ بھی کہا تھا:

''ناول نگار کا کمال اس میں ہے کہ وہ ایسے کرداروں کی تخلیق کرے جو اپنے حسن عمل اور طرز فکر سے قاری کی دلچسپیوں کو جذب کرے''

یہ باتیں مثالی زیاد ہیں، بدلتے ہوئے فکر و نظر نے یہ بھی ثابت کیا کہ محض حسن عمل سے کردار بڑے نہیں ہوتے بلکہ اکثر ان کا بڑکپن ان کی متضاد فطرت اور جبلت میں پوشیدہ رہتا ہے۔ راشد اس ناول کا مرکزی کردار ضرور ہے اور وہ اپنے حسن عمل اور طرز فکر سے متوجہ ضرور کرتا ہے لیکن اصلی دلچسپی و توجہ کا مرکز قدیر ماموں، ان کی بیگم اور پروفیسر بنتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے منیجر کا کردار بھی متوجہ کرتا ہے جو اچھے خیالات کا ہوتے ہوئے بھی کاروباری ہے۔ ماموں امریکی ہوتے ہوئے مشرقی ہیں اور مشرقی ہوتے ہوئے بھی امریکی یا مغربی۔ اپنی بیوی کو قید میں رکھنا اور بیوی کا امریکہ جیسے آزاد اور انسانی حقوق والے ملک میں رہتے ہوئے مجبور ہونا متوجہ بھی کرتا اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ممانی کا کردار اگر اور پھیلتا، اپنے تضادات کے مزید Develop کیا جاتا تو ناول میں ایک بے جان کردار جان ڈال سکتا تھا، اس لیے کہ ناول کا کام صرف دل بہلانا نہیں، وہ اگر کراس (Cross) کو پیش کرتا ہے، تضادات کو فن بناتا ہے تو ساتھ ہی سماج کی آڑی ترچھی لیکن سچی تصویریں پیش کر کے قارئین کے جذبات اور خیالات کو ارفع اور نظر کو بلند تر بھی کرتا ہے۔ احتشام حسین نے ایک مضمون میں اچھی بات کہی تھی کہ ناول محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ سماجی اور معاشری رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی ہے اور فکر و شعور کا سفر بھی۔ اس کا احساس عبدالصمد کو ہے اسی لیے ناول میں جا بجا ایسے تخلیقی و تفکیری جملے سجاتے چلتے ہیں جن میں ایک جہان معنی پوشیدہ رہتے ہیں۔ مثلاً

''یہاں کی مٹی سے وہ عیش و عشرت کے گھروندے تو تعمیر ہو سکتے ہیں مگر سچ مچ کا گھر نہیں بنا سکتے''

''تنہائی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بے سمت سوچ کا تیر چاروں طرف سے آنے لگتا ہے اور سارے ذہن و جسم کو لہولہان کر دیتا ہے''

''یہاں تو عیش وعشرت کی وہ چیزیں تھیں جن کے بارے میں انہوں نے ''بہشتی زیور'' میں بھی نہیں پڑھا تھا''

''یہاں تو جینا جتنا مشکل ہے، مرنا اس سے زیادہ مشکل''

''زندگی گزارنا چوں کہ سامنے کا مسئلہ ہے اس لیے اس کے حل کے لیے سب لگ جاتے ہیں۔ مرنا آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے مگر سامنے آجاتا ہے تو پھر''۔

ایسے معنی خیز وفکر انگریز جملوں سے ناول بھرا پڑا ہے جو ناول کو تخلیق انگریز ہی نہیں فکر انگیز بھی بناتا ہے۔ سماجیات اور سیاسیات عبدالصمد کے محبوب ترین موضوعات ہیں اس لیے بڑے نپے تل اور ڈھلے ڈھلائے مکالمے اس ناول میں جا بجا مل جائیں گے جس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ ناول دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ان دونوں حصوں پر الگ الگ ناول بھی لکھے جا سکتے تھے لیکن ناول نگار نے ایسا نہیں کا اور دونوں حصوں کو مربوط کر کے ایک ناول بنا دیا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ عبدالصمد کے سابقہ ناولوں کے مقابلے اسے وسعت (Expansion) ملتی ہے، کینوس بڑا ہوتا ہے لیکن کچھ سوالات بھی قایم کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

''کیا عبدالصمد اس ناول میں روایتی حقیقت پسندی کے تصور سے اوپر اٹھے ہیں یا کچھ تخلیقی آمیزش اور تخیل کی کارفرمائیاں بھی کام کرتی نظر آتی ہیں؟''

''کیا عبدالصمد کا یہ ناول ان کے سابقہ ناولوں کے مقابلے گہرے سماجی شعور کا مظہر بنتا ہے، یا سماج کی پیچیدہ تصویر پیش کرتا ہے؟

کیا وہ کردار کے ذریعہ سماج کو پیش کرتے ہیں، یا سماج کی تصویر پیش کرنے کے لیے کرداروں کا سہارا لیتے ہیں، ان کی نظر میں اولیت کسے دی جانی چاہیے؟

کیا ان کے کردار اور موضوع کی ہم آہنگی تخلیقی بصیرت، امید ونشاط کی کیفیت، تصور وتخیل کی اشاریت فن کا روپ لے پائی ہے؟

یہ سوالات دیگر قارئین کی بھی ہو سکتے ہیں جن کا جواب وہ ناول میں تلاش کریں گے۔ فن سے متعلق آخری سوال اس لیے اہم ہے کہ ناول کو پہلے ناول ہونا چاہیے، حقائق کی کتاب یا سماجی دستاویز نہیں۔ لیکن کہیں کہیں یہ دستاویز بننے لگتی ہے لیکن یہ شاید موضوع کی مجبوری زیادہ ہے ناول نگار کی کم باقی کے جوابات اثبات میں اس لیے ہیں کہ اس ناول میں فن کی گہرائی جو بھی ہو لیکن عبد الصمد کے گہرے سماجی شعور اور ان کی پیچیدگی، بولتی ہوئی سیاست، صارفیت وغیرہ سے متعلق سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سوال اگر اٹھتا ہے تو صرف اتنا کہ یہ سوال تخلیقی جمال اور فنی کمال بن پایا یا نہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ جدید دور میں ناول نگاری کے فکر وفن کے تعلق سے جو پھیلاؤ آیا ہے اس سے بہت کچھ بدلاؤ بھی آیا ہے، دیگر زبان و ادب میں تو ایسے ایسے سماجی موضوعات آ گئے ہیں جن کا ابھی اردو میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یوں بھی ناول کو بار بار کل بھی اور آج بھی زندگی کا رزمیہ ہی کہا گیا ہے۔ روسی نقاد رال فاکس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ناول اور عوام'' (The Novel and People) میں بار بار لکھا:

''ناول ہماری تہذیب کی تاریخ ہے''

''ناول ہمارے جدید پورژوائی سماج کے رزمیہ فن کی شکل ہے''

اور یہ جملے بطور خاص ملاحظہ کیجئے:

''ناول فرد سے گفتگو کرتا ہے، یہ فرد معاشرے اور فطرت کے خلاف عظیم جدوجہد اور کشمکش کی داستان اور یہ ویسے ہی معاشرے میں پروان چڑھتا ہے جہاں انسان، سماج، فرد اور

معاشرے میں توازن قایم ہوگیا ہو‘‘۔

ورجینا وولف نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ ناول وہ شتر مرغ ہے جو کٹھور سے کٹھور اشیا کو ہضم کر جاتا ہے۔ اگر فاکس اور وولف کی یہ باتیں درست ہیں تو عبدالصمد کا یہ ناول اس کسوٹی پر کھرا ہی اترے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ عبدالصمد کی پیش کش کی سادگی، اسلوب کی شفافیت اور موضوع کی معنی خیز پیش کش انہیں روایتی ہی سہی لیکن ناول کے وسیع تر تصور کے آس پاس دکھائی دیتی ہے اور بعض معنوں میں پریم چند اسکول کے قریب لے جاتی ہے اس لیے میں نے ارادتاً بار بار پریم چند کے حوالے دیئے ہیں تا کہ ایک فکری وفنی رشتہ بن سکے اور یہ بھی ظاہر ہو سکے کہ آسان زبان میں افسانہ یا ناول لکھنا زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے اور یہ مشکل کام عبد الصمد کئی دہائیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں، اس لیے ان کے ناول محض ناقدین کے لیے نہیں بلکہ عام قارئین کے لیے بھی ہوتے ہیں اس لیے کہ اس میں عام انسان اور عام مسلمان ہوتے ہیں۔ مسلمان لفظ سے یاد آیا کوئی خاص وسنجیدہ قاری عبد الصمد پر یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ عبدالصمد کے بیشتر ناول مسلمانوں کے مسائل تک کیوں محدود رہتے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہوسکتا ہے کہ دنیا میں سماج میں ہر طرح کے مسائل ہیں، دیگر قومیں ہیں، سماج کے اور بھی طبقے ہیں، عبدالصمد کی نظر ادھر کیوں نہیں جاتی (یہ الزام اردو کے بعض دوسرے ناول نگاروں پر بھی لگائے جا سکتے ہیں) کبھی علی سردار جعفری نے ایک شعر سنایا تھا:

دریدہ دامنوں، خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں

اب یہ شعر اردو کے تازہ ترین ناولوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ میں اپنے طور پر سمجھتا ہوں کہ کچھ موضوعات ایسے ہو جاتے ہیں جن پر ناول نگار کی گہری دلچسپی اور مشق ہو جاتی ہے، وہ انہیں پر لکھنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتا ہے اور گہرائی میں جا کر لکھتا ہے۔ پھر بھی اگر یہ سوال یا الزام لگتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن پھر یہ الزام پریم چند کے دیہات، بیدی کے پنجاب، قرۃ العین حیدر کے تاریخ وتہذیب اور انتظار حسین کی ہجرت کے موضوع پر بھی لگنا چاہیے کہ ان کی زیادہ تر تخلیقات انہیں موضوعات کے اردگرد دکھائی دیتی ہیں۔ کسی ایک ناول نگار کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں بنتا لیکن اگر اردو کے بیشتر ناول نگار عام انسان سے ہٹ کر محض مسلمان، اس کے عروج وزوال، ماضی اور حال کو ہی تختہ مشق بنالیں اور ان کے فکر وعمل کا محور مسجد، مدرسہ، خانقاہ، امام باڑہ وغیرہ تک سمٹ جائے تو پھر ایک نہیں کئی بڑے سوالات جنم لینے لگتے ہیں اور ان کی محدودیت پر اعتراض کرنا واجب سا لگنے لگتا ہے۔ ان شکووں پر فنکاروں کو برا ماننے کے بجائے سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عبدالصمد کا یہ نیا ناول پھیل کر مشرق ومغرب کی سیاست و معاشرت کا احاطہ کرتا ہے اور اس نسبت سے اس ناول کا عنوان نہ صرف شاعرانہ ہے بلکہ مفکرانہ اور کسی حد تک صوفیانہ بھی کہ یہ جہاں تیرا ہے یا میرا یا سب کا یا کسی کا نہیں۔ جیسا کہا گیا کہ ناول اپنے عہد کا رزمیہ ہوتا ہے اور ناول نگار اپنے عہد کے رزمیے، رمزیے سے بچا کر اسے بامعنی اور پُر اثر انداز سے پیش کر دے یہ بڑی بات ہوا کرتی ہے۔ یوں بھی ناول لکھنا، ضخیم ناول لکھنا بڑے حوصلے کی بات ہوا کرتی ہے۔ عمر کی اس منزل میں عبدالصمد کا یہ حوصلہ برقرار ہے، ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

شرف النہار

مضمون

''شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف''

اکبر الہ آبادی کا نام جب بھی آتا ہے تو صرف یہی سوال ذہن کی سطح سے سر اٹھاتا ہے کہ وہ تو ایک مزاحیہ شاعر تھے جو اپنی قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے سبب اردو ادب میں مشہور ہوئے۔انہوں نے تو طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے اخبار''اودھ پنچ'' سے اپنا رشتہ استوار کیا اور جدید تہذیب' نئے انکشافات اور نئے تعلیمی رویوں کا خوب خوب مذاق اڑایا ہے۔لیکن کیا ہمارے ذہن پر کبھی اس خیال نے بھی دستک دی کہ آخر وہ کون سے اسباب وعلل تھے جو اس شاعر کی جمیعتِ خاطر کو پراگندہ کیے ہوئے تھے؟ وہ اپنے عہد کی ترقیِ رفتار اور انگریزی سرکار کی نعمتوں سے کیوں متنفر تھے؟ جس سائنسی کرشمہ سازیوں اور تعلیمی معیار کی بلندیوں کو لوگ باعثِ رحمت تصور کر رہے تھے اکبر الہ آبادی کو ان سے اختلاف کی گنجائش کیوں کر تھی؟ ظرافت کی سیاہی میں نوک قلم کو ڈبو کر وہ کون سا معرکہ سر کرنا چاہتے تھے؟ لہٰذا ان تمام سوالوں کے جواب شاعر کی ظریفانہ اور طنزیہ ومزاحیہ شعری فکر کی تہوں میں تلاش کرنا ہوں گے۔مزید یہ کہ ایام ماضی کی طرف مراجعت کرنا ہوگی جس میں اس وقت کا عوام سانس لے رہا تھا اور اکبر نے جب اپنی محسوساتی حس سے زندگی اور سماج کی تلخ حقیقتوں کا مطالعہ کیا تو اپنے مخصوص پیرائے بیان میں یہ کہتے ہوئے نظر آئے ۔

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

سترہویں صدی میں انگریزوں کا بہ غرض تجارت ہندوستان آنا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان پر مسلط ہو جانا' مغل بادشاہت کا خاتمہ اور برطانوی سلطنت کا قائم ہونا اور پھر ان علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ' جو بالخصوص مسلمانوں کی طاقت کے مراکز تصور کیے جاتے تھے۔اس کے بعد ہندوستانی قوم کا دو گروہوں میں تقسیم ہو جانا' جس میں ایک گروہ انگریز قوم اور انگریزی حکومت کا طرف دار تھا۔بقول اکبر' ان کے ہر فعل کو نعمت تصور کر کے اپنانے والا' ان کے تہذیبی اور تعلیمی نظریہ کی قدر کرنے والا' ان کے نقطۂ نظر کو سراہنے والا' ان کی جی حضوری کرنے والا گویا ان کی ہر ادا کا مدّاح تھا۔دوسرا گروہ وہ تھا جو برطانوی حکومت کی نعمت کو بھی لعنت سمجھنے والا' ان کی نیت اور حکومت پر شک کرنے والا' نئی روشنی ونئی تعلیم سے خائف اور انگریزی تصورات و اقدار سے بیزاری ظاہر کرنے والا تھا۔چنانچہ اُس عہد کے یہ وہ حالات تھے جس نے ہندوستانیوں کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ایسے حالات میں کہ جب ہم ہندوستانی ہی ایک دوسرے کی نیت پر شک کرنے لگیں تو پھر ملکی اتحاد اور سالمیت کا سوال ہی فضول اور بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔

مذکورہ تمام حالات کا سرچشمہ ہمیں 1857ء کے غدر' اور بعد کی صورتِ حال کو سمجھنا چاہئیے کہ جس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا اور ادب کے ساتھ سیاست' سماج' تہذیب' مذہب اور روایت غرض ہر چیز کے تصورات میں تبدیلی رونما ہوئی۔دیکھتے ہی دیکھتے برطانوی حکومت کو زبردست استحکام حاصل ہوا۔اقتدار کے بعد ان کے اذہان میں یہ خیال اور بھی راسخ ہو گیا کہ بغاوت کرنے والوں میں ہندوؤں سے زیادہ مسلمان پیش پیش تھے۔چنانچہ سرکشی اور بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہراتے ہوئے ان کے ساتھ بڑی بدسلوکی اور بے رحمی کا رویہ اختیار کیا گیا۔انہیں سرکاری ملازمتوں سے محروم' جائدادوں سے بے دخل اور گھر سے بے گھر کرنا شروع کر دیا۔گویا ان کے ساتھ مثل جانور کا سلوک کیا

گیا۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا پر آشوب دور تھا۔ ایسے حالات میں وہ کیا کریں اور کدھر جائیں ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

لہٰذا اکبؔر نے اپنی شاعری میں انہیں حالات کو جگہ دی ہے اور ہر طریقہ سے بڑھتے ہوئے مغربیت کے سیلاب کو روکنے اور مسلمانوں کو اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ ان کی شاعری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے ان کا پہلا دور ابتداء سے 1879ء روایتی شاعری سے مختص کرتے ہیں جس میں رنگ تغیر کے ساتھ متقدمین سے متاثر ہونے کے اثرات نظر آتے ہیں -ان کی اس دور کی شاعری کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بچپن کی شاعری کا دور کہا ہے۔ جس میں عشقِ مجازی اور محبت میں سرشاری کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں
کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

وہ توموسیٰ ہوا جو طالبِ دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہوگا جس نے تمہیں دیکھا ہوگا

دن رات رقیبوں پہ ہے صاحب کی عنایت
بس ایک غمِ ہجر میں نالاں ہیں تو ہم ہیں

اکبؔر کی شاعری کے دوسرے دور یعنی 1880 تا 1903ء کو ایک ایسا آلۂ کار سمجھنا چاہئیے جس کو اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دور کی تغیر پذیری کا سامنا کیا اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اردو شاعری میں طنزیہ وظریفانہ شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ اس طرز کو اختیار کرنے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ فطرتاً ظریف تھے۔ دوسرے جس عہد میں ان کی مزاحیہ شاعری منظرِ عام پر آئی وہ دور خصوصاً لکھنؤ میں ''اودھ پنچ'' کے عروج کا زمانہ تھا اور اکبر بھی طنزیہ ومزاحیہ شاعر کی حیثیت سے ''اودھ پنچ'' سے وابستہ رہے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مقتضائے وقت نے بھی انہیں اس روش کو اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن تیسرے دور 1904 تا 1921 کی' شاعری اکبؔر کے نظریات وخیالات کی اعتدال پسندی کو ظاہر کرنے والی ہے گو کہ اس دور میں بھی وہ ظرافت اور طنز ومزاح سے کام لیتے رہے لیکن ان کے تنقیدی رویے اور شدت جذبات میں کچھ کمی نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی ضرورتوں اور سماجی تقاضوں کے زیر اثر اپنی فکر میں توازن پیدا کر لیا تھا۔

اکبؔر چوں کہ انگریزی حکومت میں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ایک معزز جج کے عہدے پر فائز تھے اس وجہ سے وہ انگریزوں کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ اگر چہ انہیں ملک کی سیاسی وسماجی صورت حال اور برطانوی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔ ان کے لیے یہ خیال بڑا پریشان کن تھا کہ مسلمان قوم ہر طرح سے بربادی کے دہانے پر پہنچی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے جدید وضع قطع اختیار کرنے کے جنون میں مذہب وملت کے تصور کو بالکل ترک کر دیا گویا مغرب پرستی کے سیلاب میں ان کے ہاتھوں سے دنیا کے ساتھ دین بھی بہا جا رہا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کی بیگانگی پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ ایک مذہبی انسان ہونے کے ناطے یہ غم اکبؔر کے لیے زبردست تکلیف کا باعث تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے افکار وخیالات کی پیش کش کے لیے جس ڈھال کو استعمال کیا وہ خصوصاً طنزیہ ومزاحیہ شاعری تھی۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزو ں ہی سے ڈرتا ہوں

شکر ہے راہِ ترقی میں اگر بڑھتے ہو
یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو

مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کیواڑ ہٹائے جو چول سے

خدا کے واسطے یادِ خدا کر اے اکبر
بتوں کے عشق میں جاں اپنی کیوں گنواتا ہے

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

طنز وظرافت دراصل الگ الگ طرزِ اسلوب ہیں جن کو بیشتر شعرااور ادبا نے مختلف طور پر استعمال کیا ہے۔طنز میں درحقیقت ایک طرح کی نشتریت اور کانٹے کی چبھن ہوتی ہے۔اس طرز کو اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ شاعر کو بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے کہ کہیں اس کا وار خشک واعظ کا وعظ بن کر اپنی جاذبیت نہ کھو بیٹھے اور سامنے والے کو اپنے وار سے مجروح کردے ۔کیوں کہ طنزیہ اسلوب کو استعمال کرتے ہوئے ادیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے اور حیاتِ انسانی میں در آنے والی خرابیوں' کجرویوں' کوتاہیوں اور برائیوں کو ہنستے ہنساتے اپنی نگارشات کے ذریعہ سب کے سامنے لائے اور اپنے نظریے سے آگاہی دے۔چنانچہ اس کا یہ حربہ کار بے عمل نہ بن جائے' اس خیال سے وہ طنز میں ظرافت کی چاشنی کو بھی شامل کر لیتا ہے۔جس طرح کڑوی دوا اگر مصری کی ڈلی میں لپیٹ کر کھلائی جائے تو وہ انسان کے گلے سے آسانی سے اتر جاتی ہے اسے مٹھاس کا احساس پہلے ہوتا ہے اور تلخی کا بعد میں ۔بالکل اسی طرح اکبر کے اشعار بھی ایک ایسی دوا کے مانند ہیں جو انسان کو منہ کا ذائقہ بھی بخشتے اور فکر واحساس کی دعوت بھی دیتے ہیں۔طنز ومزاح کی افادیت اور اکبر کی شاعری میں اس کے برمحل استعمال کی مثالوں کو ڈاکٹر صغرا مہدی کے اس بیان سے اور بھی واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

''طنز ومزاح کی یہ بھی افادیت ہے کہ اس پیرائے میں وہ سب افسانے بیان ہوجاتے ہیں جن کے ناگوار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔مزاح نگار ان کو اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ وہ ناگوار نہیں ہوتے' بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو آپ سنجیدہ پیرائے میں بیان کریں تو وہ افراد کی گرفت میں کیا قانون کی گرفت میں بھی آ سکتیں ہیں لیکن ان کو اگر آپ مزاحیہ پیرائے میں کہہ جائیں تو آپ کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی ہے۔طنزیہ و مزاحیہ ادیبوں کے ایسے بے شمار شعر اور فقرے گنائے جا سکتے ہیں جن میں افراد' مختلف سماجی' مذہبی اور سیاسی اداروں پر سخت تنقید ہے۔ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔مگر ان کی گرفت نہیں ہوسکتی۔اکبر کی شاعری ان کی سب سے اچھی مثال ہے۔''

1

اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ

کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ہوائے نفس کا طوفاں ہے بحرِ زندگانی میں
خدا محفوظ رکھے کشتیِ دل کو جوانی میں

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا
نہیں بدلی زباں اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے
میں جب جاتا ہوں اسکی بزم میں سٹ ڈون کہتا ہے

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مذہب سے تعلق ختم کر اسکول جا

پچھلے صفحات میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں نظریۂ اوّل الذکر سے تعلق رکھنے والوں میں اکبؔر کا اشارہ دیگر اشخاص کے ساتھ خصوصاً سرسید کی جانب تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سرسید ہی اس گروہ کی سربراہی کرنے والے ہیں۔ برطانوی ملازم ہونے کی وجہ سے وہ انگریزوں کے پٹھو ہیں اور بغاوت کے دوران انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان کا یہ خیال کہ مغربی علوم کا حصول، ادب کو قومی اصلاح کا ذریعہ تصور کرنا، مذہب کو عقل کی بنیاد پر پرکھنا اور انگریزی تہذیب و تمدن اختیار کرنے سے ہی مسلم ایک مہذب قوم کہلائے گی۔ مسلمانوں کے تئیں ایک ایسا خوابِ فریب ہے جو انہیں دین و دنیا دونوں سے بے نیاز کر دے گا۔ چنانچہ اس خیال کی پیش کش میں ہی اکبؔر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا نشانہ اس وقت کی مغربی تہذیب، اس کی اندھی تقلید، برطانوی حکومت، سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک بنی۔

اکبؔر انگریزی حکومت کی لائی ہوئی تبدیلیوں اور سرسید کے خیالات سے قطعی متفق نہ تھے اس لیے وہ مستقل ان کا مذاق اڑاتے اور ہندوستان میں انگریزوں کو جو بالادستی حاصل ہوئی اس کا الزام سرسید اور ان جیسے دیگر اشخاص پر لگاتے رہے۔ ملک کی ترقی رفتار اور سرسید کے افکار کا مضحکہ اور اپنی ناخوشی کا اظہار وہ درج ذیل اشعار میں یوں کرتے ہیں۔

ملّت کا ادب اٹھ گیا جس قوم کے دل سے
اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

اصل سے ہو کے جدا نشو و نما کی امید
مجھ کو حیرت ہے کہ بوڑھوں میں یہ بچپن کیسا

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

سید سے علی گڑھ ہی میں یہ جا کر کوئی کہہ دے
ہے تجھ کو طلب، قوم کی قسمت سے زیادہ

میں کیا کہوں احباب، کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔ اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

اکبؔر نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ اشعار میں جا بجا اس بات کا ذکر کیا ہے کہ سرسید نے اپنی نمایش و نمود اور حکّام کی خوشنودگی کے واسطے اہلِ مشرق کو گمراہ کیا ہے۔ دراصل وہ سرسید کی شخصیت

'ان کی نیت وعمل اوران کی فکر سے پوری طرح واقف نہ تھے۔وہ مذہب سے شدید لگاواورعقیدت رکھتے تھے۔ماضی پرستی اور اپنی تہذیب سے والہانہ محبت میں وہ سرسید کے مشن'اوراس سے وابستہ ترقی اورقومی بھلائی کا جو جذبہ کارفرما تھا اس کو سمجھ نہ سکے۔ان کی قدامت پسندی اور رجعت پرستی کے جوش و جذبہ نے انہیں ترقی رفتار کے مطالبات کو بھی سمجھنے سے قاصر رکھا۔اس کے برعکس سرسید ایک جہاں دیدہ انسان تھے جن کی دوررس نگاہ نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ملک وقوم کا اقتدار اس وقت تک بحال نہیں ہوسکتا جب تک ان کا ذہن وضمیر تعلیم کی نئی روشنی سے منور نہ ہوگا۔ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی پستی کا واحد سبب جدید تعلیم سے نابلد اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔مزید یہ کہ جدید تعلیم کا حصول اور سائنس کے بڑھتے ہوئے اثر کو قبول کرتے ہوئے ہی وہ نئے عہد میں اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں۔انہوں نے انگریزوں سے مفاہمت اوران کی حکمتِ عملی پر جوزور دیا وہ ان کی اسی مصلحت پسندی کا نتیجہ ہے جس کے سبب وہ اکبر جیسے شعرا اور دیگر ادبا کے ہاتھوں معتوب بھی ہوئے لیکن کسی کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم رہے۔انہوں نے اپنی قوم کی بہبودی کے لیے جس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دیے وہ آج روزِ روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ان کی نیت اورعمل پر شک کرنے والے اکبراور دیگر حضرات بھی ان کی نافراموش کردہ خدمات اورعلی گڑھ تحریک کا جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت کو جھٹلا نہ سکے اور کہہ اُٹھے واقعی سرسید کے دل میں قوم کا درد تھا اور پھر اکبر نے بھی سرسید کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس کا اعتراف یوں کیا۔

صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سُنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام

واضح ہو کہ یہ سب اس وقت ممکن ہوا جب اکبر کا شعور بالیدہ ہوا'ان کی طبیعت کی ہیجانی کیفیت دور ہوئی اور عقل نے نئی روشنی کو عہد کا تقاضا تصور کیا۔مزید یہ کہ سرسید پر مسلسل وار کرنے والے اکبر کی جب سرسیّد سے ملاقات ہوئی۔ان سے گفتگو کی اور تبادلۂ خیال کے بعد انہیں یہ احساس ہوگیا کہ ان کی نیت میں خرابی نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنی خدمات'اورعلی گڑھ تحریک کے تحت جس طرح کا اخلاقی'سماجی اور مذہبی اصلاح کا طریقہ ایجاد کیا وہ یقیناً سودمند ہے تو اکبر اس سے متاثر ہوئے اور یہیں سے اکبر کے رویہ اور نظریہ میں تبدیلی آئی جس کا اظہار انہوں نے اپنے دوست عزیز لکھنوی سے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''آپ کا خیال صحیح ہے کہ پرانے
لوگ لکیر کے فقیر ہیں اور ضرورتِ
زمانہ سے بے خبر ہیں۔بے شک نئی
روشنی کا ساتھ دینا چاہئے ورنہ کس
کے ہوکر رہیں گے اور کدھر جائیں
گے۔'' 2؎

آخری عمر میں اکبر نئی روشنی ورفتار اور جدید مکتبۂ خیال کے پیروکار سرسید اور دیگر قائدین کے نظریۂ فکر کے معترف بن گئے تھے اور سرسید کی وفات کے بعد ان کے مشن کی افادیت پر ایمان لے آئے تھے۔ایک قطع میں ان کی خدمات کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ سمجھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اکبر اپنے نصب العین میں اس حد تک کامیاب ہوئے

ہیں کہ انہوں نے بڑھتے ہوئے مغربیت کے طوفان میں بہہ جانے والے نوجوانوں کو یہ احساس ضرور بخشا ہے کہ صرف نئے زمانے کی اندھی تقلید ہی زندگی کی ترقی کا راستہ نہیں بلکہ عقل وشعور کے ساتھ مفید اور کارآمد چیزوں کو اپنانا اور اپنی زندگی کو کامیاب بنانا بھی ایک ہوش مند انسان کی علامت ہے۔ان کی شاعری کا رجحان معاشرتی اور مذہبی تھا۔ان کے یہاں زندگی کی مخصوص قدروں کی ایک خاص زاویہ سے جھلک ملتی ہے۔انہوں نے اپنے ماحول کی ترجمانی میں جو راستہ اختیار کیا وہ بالکل الگ تھلگ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات موجودہ دور کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکے۔

بہرحال اکبرؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اس عہد میں کہ جب' سرسید اور ان کے رفقا سنجیدہ مضامین' انشائیوں اور سنجیدہ شاعری سے اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ادب کا کام انجام دے رہے تھے انہوں نے ظرافت کا نقاب چہرہ پر ڈال کر اخلاقی نصیحت' مذہبی فکر اور سماجی اصلاح کا کام انجام دیا ہے جس سے ان کے شعری افکار' جامع تصوراتِ حیات کے آئینہ دار بن گئے اور ظرافت کے لحاف کی حدّت وحرارت نے قاری کے اذہان کو بھی گرمانے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا۔حقیقت یہ بھی ہے کہ اکبر کا طنز ومزاح کسی ذاتی اختلاف' ادبی معرکوں یا انسان کی تضحیک سے عبارت نہیں وہ ایک سنجیدہ مزاح نگار تھے ان کی شاعری کا مقصد صرف تفنن طبع نہ تھا بلکہ اپنے شعری پس منظر میں سماج کے نقاد اور نظریہ ساز کی حیثیت سے سامنے آئے۔انہوں نے بادِمخالف کی سرد ہواؤں کو رد کرنے کے لیے ہی ''ظرافت کا لحاف اوڑھا''۔اکبر کا منفرد فکری احساس' طریقۂ اظہار اور شعری انداز کو قاضی جمال حسین کی ذیل تحریر سے اور بھی واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

> ''اکبر کی ظرافت اور ان کے طنز کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ شخصی' ذاتی یا واقعاتی نوعیت کی مزاح نگاری سے دل بہلانے اور ہنسنے ہنسانے کے دلچسپ مشغلے سے خوش وقت ہونے کے بجائے ان کی ظرافت کی بنیاد ایک مرتب اور جامع تصورِ حیات پر ہے۔۔۔اکبر کی ظرافت کا افق بہت کشادہ اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ایک مکمل نظامِ حیات کی نمائندگی کے سبب اس نظام سے وابستہ تمام مظاہر اکبر کی شاعری کا موضوع ہیں۔سیاسیات' اخلاقیات تہذیب' تعلیم' مذہبی عقائد' عائلی زندگی' فکری ورثہ' غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تقریباً تمام پہلو اکبر کی شاعری میں ہر آن کسی لطیف اور انوکھے پیرائے میں ظاہر ہوئے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ ایک مخصوص تصورِ حیات سے وابستہ ہونے کے سبب ان کا پورا کلام ایک بڑی وحدت اور اکائی معلوم ہوتا ہے۔''3

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ اکبرؔ کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ''۔ڈاکٹر صغرا مہدی' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی' بار اوّل' 1981ء۔ص۔257-256

2۔ مکتوب بنام عزیز لکھنوی ''مشاہیرِ اردو کے خطوط''۔مرتبہ مہیش پرشاد اور مولوی فضل۔ص۔30

3۔ اکبر کی معنویت۔کچھ بنیادی باتیں۔قاضی جمال حسین۔فکر و تحقیق' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نئی دہلی۔2009۔ص۔67

رفیعہ سلیم

مضمون

رضاء الجبّار فکر وفن

مختصر افسانہ ہندوستان میں بیسویں صدی کی ابتداء کے ساتھ ابھرا۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم مختصر افسانہ کے اہم بانیوں میں سے ہیں۔ پریم چند سے لے کر 1950ء تک افسانہ نگاری میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فنی اعتبار سے بھی افسانہ ترقی کیا اور ساتھ ہی ساتھ 1936ء کی ترقی پسند تحریک نے ''افسانوی ادب'' کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح پریم چند سے تا حال مختلف روپ بدل کر مختصر افسانہ زمانے کے ساتھ ساتھ کروٹ بدلتا رہا اور زندگی کی پیچیدگیوں میں افسانہ بھی مبتلا ہوتا چلا گیا۔ اس طرح افسانہ بھی ماحول اور زمانے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

حیدرآباد کی سرزمین ادب کے مختلف نظریات کا گہوارہ رہی ہے کہ جس سرزمین نے کئی علم و دانش کی عظیم ہستیوں کے جسد خاکی کو ''احسن التقویم'' کا امتیاز بخشا۔ اسی شہر دلنواز کی مٹی سے رضاء الجبار کا خمیر بھی اٹھا۔ روزگار کے سلسلے میں ممبئی ہجرت کی اور پھر ''کینیڈا'' دیار غیر چلے گئے۔ ان ہجرتوں کا ان کے فن پر ایک خوشگوار اثر ملتا ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں۔ رضاء الجبار کے افسانوں کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم عصر افسانہ نگاروں سے کسی طرح کا اثر قبول نہیں کیا۔ اپنی شناخت منفرد بنائی۔

رضاء الجبار 10 مارچ 1936ء کو شہر حیدرآباد کے محلّہ کاچی گوڑہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی ننھے رضاء الجبار نے اپنی زندگی کا ایک برس بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ پولیو کے مرض سے متاثر ہوگئے۔ اس سانحہ کے بارے میں تفصیل خود رضاء الجبار کی زبانی سنئے:

> ''سال 1936ء میں اپنی پیدائش کے بعد ابھی ایک سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ مجھ پر پولیو کی بیماری کا حملہ ہوا۔ یہ حملہ بڑا شدید تھا۔ میرے دونوں پاؤں کی قوت مکمل طور پر زائیل ہوگئی۔ دونوں ہاتھ بڑی حد تک کمزور ہوگئے۔ صرف سر اپنی صحت مندی کو برقرار کرتا ہوا رہ گیا تھا۔ یہ حالت جاری رہی اسکول جانے کی عمر تک پہنچا لیکن اسکول نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے گھر پر ہی میری پڑھائی کا انتظام ہوا''۔
>
> (شخصی انٹرویو)

رضاء الجبار نے اپنے والد عبدالجبار کے دامن تربیت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں دارالعلوم ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور اسی اسکول سے 1952ء میں میٹرک درجہ اول سے کامیاب کیا۔

رضاء الجبار نے 1957ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی کام کامیاب کیا اور وہیں سے 1960ء میں ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ پانچ سال بعد بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے رضاء الجبار نے 1965ء میں ایل ایل بی کیا اور 1974ء میں بمبئی سے ہی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد رضاء الجبار کو ذریعہ معاش کی فکر ہوئی۔ 1981ء کے اوائل میں بمبئی کی بحری جہاز بنانے والی کمپنی میں بطور اکاؤنٹس آفیسر ملازمت حاصل کی۔ اور اس کے ساتھ برہانی کالج بمبئی میں جز وقتی خدمات بھی انجام دی۔

رضاء الجبار نے 23 مارچ 1967ء کو ایک بوہرہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی خاتون ''زرینہ رنگ والا'' سے شادی کی۔ رضاء الجبار اپنی شادی اور شریک حیات کے بارے میں ایک مضمون میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''میری شادی 23 دسمبر 1967ء میں ہوئی۔ شادی رشتہ داروں میں نہیں بلکہ غیروں میں بلکہ سنی فرقہ سے ہٹ کر ہوئی۔ شادی سے قبل اہلیہ کا نام ''زرینہ رنگ والا'' تھا۔ انہوں نے پونا یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا ہے۔ دس سال کے لگ بھگ ٹیچرس ٹریننگ کالج فار گرلز (بمبئی کرلا) میں لکچرر کے طور پر کام کرتی رہیں''۔

(شخصی انٹرویو)

رضاء الجبار اپنی شریک حیات اور بچوں کے ساتھ اپریل 1981ء میں ٹورنٹو کینیڈا منتقل ہوئے جہاں انہیں شہریت مل گئی۔ کینیڈا میں خود کو Establish کرنے کے لیے انہیں بے حد جدوجہد کرنی پڑی۔ جب کچھ وسائل پیدا ہوئے تو انہوں نے اپنی ذاتی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ فرم قائم کرلی۔ 1990ء کے لگ بھگ انہیں حکومت کینیڈا کے سرکاری محکمہ میں ملازمت ملی جہاں وہ انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اپنے فرائض کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے 2000ء میں سبکدوش ہوئے۔

دیار غیر میں رہے کر بھی وہ اپنے باطن کے تخلیق کار کو ملحوظ رکھا اور ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ترک وطن کے بارے میں رضاء الجبار تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں:

''ترک وطن کے دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ میں ایک سمینار میں پرچہ پڑھنے کے لیے وینی پیگ آیا تھا۔ وہاں جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے نقطہ نظر سے وہاں پر مجھ جیسے جسمانی طور پر معذور لوگوں کے لیے کافی کچھ سہولتیں ہیں۔ مثلاً معذور لوگوں کے لیے اسپیشل قسم کی کاریں، وہیل چیئرس وغیرہ جو مجھے اچھا لگا۔ اسی خیال سے میں نے وہاں سکونت اختیار کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے میری کوشش کو کامیابی نصیب کردی اور میں ترک وطن کرکے کینیڈا کی سکونت اختیار کرلی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں یعنی 1975ء سے 1985ء کے لگ بھگ ترک وطن کرنے اور بیرون ملک جاکر ملازمت کرنے کی ایک لہر چل رہی تھی ورنہ ایسا سمجھا جارہا تھا کہ فلاں شخص کی قابلیت میں کھوٹ ہے۔ شاید اس لیے وہ بیرون ملک جانا مناسب نہیں سمجھ رہا ہے''۔

(غیر مطبوعہ مضمون)

رضاء الجبار ایک پہلودار شخصیت کے مالک ہیں۔ کسی بھی انسان کی شخصیت کے لیے اس کے خاندان کے حالات اور اس دور کے سماجی، تہذیبی اور ادبی ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ رضاء الجبار کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان کے گھریلو ماحول کا اہم حصہ رہا ہے۔ خصوصاً ان کے والد کی علمی وادبی شخصیت نے رضاء الجبار کو بے حد متاثر کیا۔

رضاء الجبار بچپن ہی سے ذہین رہے۔ رضاء الجبار کی شخصیت میں خودداری کے ساتھ عزم مصمم بھی بے پناہ تھا۔ گوپی چند نارنگ نے رضاء الجبار کے عزم اور حوصلے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''وہیل چیئر سرکاتے ہوئے ہشاش وفعال دیکھا ہے۔ وہ ہر جگہ پہنچتے ہیں اور سب سے رابطہ رکھتے ہیں۔ بچپن میں پولیو کا حملہ ہوا اور وہ چلنے سے رہ گئے۔ لیکن اس معذوری کو انہوں نے کبھی معذوری نہیں بننے دیا۔ بلکہ اچھے اچھوں سے بھی وہ زیادہ متحرک اور سرگرم

رہتے ہیں۔ ایک بار جو میں بے طرح اپنے
کاموں سے اکتایا ہوا تھا اور ان سے ملنے ان
کی طرف جانا نہ ہوسکا تو وہ ایک ایسی جگہ آن
پہنچے جہاں ان کا پہنچنا بظاہر ممکن نہ تھا۔ ناممکن کو
ممکن بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے''۔
''حرفے چند'' (سنگ اُٹھانے کا حوصلہ)
(افسانوی مجموعہ)

رضاء الجبار کی شخصیت نے کبھی حالات سے شکست قبول نہیں کی۔ جدوجہد کو اپنی منزل کا رہبر و رہنما بنایا اور ہر گام پر نہ صرف کامیابی حاصل کی بلکہ اپنے تجربات سے ہر مشکل مرحلہ کو جانچا پرکھا اور منزل پر منزل طے کرتے چلے گئے۔

رضاء الجبار مغرب میں بھی مشرقی روایات تلاش کرتے رہے۔ وہ اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ تو گئے تھے لیکن ادب کا مطالعہ کرنا اور افسانے تخلیق کرنا ان کے ساتھ تادمِ حیات چمٹا رہا۔ اسی طرح ادبی انجمنوں سے وابستگی بھی رضاء الجبار کی پسندیدہ مصروفیت رہی۔ سرزمین حیدرآباد ہو کہ ممبئی، ٹورنٹو، کینیڈا، ادبی انجمن قائم کرنا، ادبی اجلاس منعقد کرنا اور ادب کے فروغ کے لیے کوشش و جستجو کرنا رضاء الجبار کے ذوق وشوق کا حصہ رہا۔

رضاء الجبار کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہی ہو چکا تھا۔ جب وہ ابھی دس برس کے تھے کہ ان میں کہانیاں لکھنے کی اُپج جاگ اٹھی تھی۔

دس برس کی عمر میں کہانی لکھنے کا جو چسکا لگا تو یہ ذوق وشوق آخر سفر تک جاری وساری رہا۔ رضاء الجبار نے شروع ہی سے کہانی اور اس کے فن کو اپنا محبوب بنایا اور اس طرح افسانہ ان کا اولین عشق قرار پایا۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ''لڑکیوں کا وارڈ'' 1954ء میں اس وقت لکھا جب وہ بمبئی کے آرتھو پیڈک اسپتال میں زیر علاج تھے۔

یہ ایک طالب علم کی اولین کوشش تھی جو آگے چل کر اس کی شناخت کا سبب بنی۔

رضاء الجبار نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ مطالعہ کی وسعت نے انہیں تخلیقی فن پر کمندیں ڈالنے پر مجبور کیا اور انہوں نے اس فن کو تسخیر کرنے کی ہر ممکن کوشش وسعی کی۔ رضاء الجبار نے کبھی نقادان ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے اپنے فن کے علاوہ کوئی دوسرا حربہ استعمال نہیں کیا۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے نقاد کی تائید وستائش حاصل کرنے کی کبھی شعوری کوشش نہیں کی۔ ان کے ادبی سفر کا یہ اعزاز ہے کہ عہد حاضر کے فکشن کے تمام اہم نقادوں نے ان کے فن کو قابل توجہ سمجھا اور ان کے فن کی داد دی ہے جن میں قابل ذکر نام پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، ظ انصاری اور رتن سنگھ ہیں۔ رضاء الجبار کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''روشنی کی کرن'' کے عنوان سے 1971ء میں شائع ہوا۔

1985ء میں رضاء الجبار نے اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا۔ 1993ء میں ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' منظر عام پر آیا۔

1996ء میں ''سنگ اٹھانے کا حوصلہ'' ادبی منظر پر نمودار ہوا۔ یہ ان کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ 2006ء میں رضاء الجبار کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ ''سہاروں کا موسم'' شائع ہوا۔ یہ ان کا تادم حیات، آخری مجموعہ ہے۔

رضاء الجبار کو افسانے کے فن پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ افسانے کی ابتداء کس طرح کرنی چاہئے۔ کہانی کا عروج کس طرح قاری کے سامنے لایا جائے۔ اس کا بھی انہیں علم ہے اور کہانی کے اختتام کو پر تاثر بنانے کا فن بھی وہ جانتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے جدید افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ افسانے کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ قاری اس کے ابتدائی آٹھ سطریں پڑھ لے تو پھر افسانہ ختم کیے بغیر نہ رہے۔ رضاء الجبار کے افسانوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ چنانچہ

تاجدار احتشام صدیقی لکھتے ہیں:

''رضاء الجبار نے ہر افسانے میں یہ التزام رکھا ہے کہ افسانے کی پہلی سطر سے قاری ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس ساتھ چلنے کے عمل میں پہلی سطر سے آخری سطر تک مختلف مرحلوں سے وہ گزر جاتا ہے۔ خوشی، غم، مسرت، رنج، دکھ کے مختلف جذبات اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں''۔ (رسالہ شاعر، نومبر 2007ء)

رضاء الجبار کے افسانوں کے موضوعات بڑے متنوع ہوتے ہیں۔ انہوں نے گاؤں کے دیہی مسائل سے لے کر بین الاقوامی تہذیبی تصادم تک کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے ہندوستان سے کینیڈا ہجرت کی ہے اس لیے ان کے یہاں مشرق و مغرب کے معاشرتی و تمدنی حالات میں تصادم ملتا ہے۔ دونوں دنیاؤں میں موجود رہن سہن، رسم و رواج کے فرق کو بھی بڑی خوبی سے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ رضاء الجبار کے افسانوں میں موجود اس تہذیبی تصادم پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ان کے حوالے سے جو بات سب سے اہم عرض کرنے کی ہے وہ یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے جو تارکین وطن یورپ، کینیڈا اور امریکہ یا دوسرے ممالک میں بس گئے ہیں ان کی تحریروں میں تصادم قدم قدم پر نت نئے شکلوں میں ابھرتے ہیں۔ مسئلہ فقط طور طریقوں، رسم و رواج اور رہن سہن کے فرق کا نہیں، ذہنی افتاد، قدروں کے فرق اور تہذیبی رویوں کا ہے۔ جو اصلاً زبان کے اندر سموئے ہوتے ہیں اور جن سے دوسرے تمام فرق پیدا ہوتے ہیں۔ ٹکنالوجی اور سائنس وصنعت کے یلغار اس پر مستزاد ہے جو مشرق و مغرب کی کھائی کو زیادہ گہرا کرتی جاتی ہے''۔

(سنگ اٹھانے کا حوصلہ)

رضاء الجبار نے اپنے افسانے ''بے کار باتیں'' میں تارکین کی اس اندرونی کشمکش کو بڑے خوبصورت انداز میں سمویا ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں لگے ہوئے شیشوں کی وجہ سے سننے کی حس کا ختم ہو جانا، کمرے میں ستائیں کھڑکیاں جو باہر کی دنیا میں کھلتی ہیں اور ہر کھڑکی کے سرے پر اژدہا، جیسے مکالموں کے ذریعہ انہوں نے اس تہذیبی کشمکش میں تارکین وطن کے شکست وریخت کی جانب قارئین کو متوجہ کیا ہے۔

یقیناً ادب ہی کسی بھی فنکار کے فن کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ رضاء الجبار کے افسانوں میں مغرب و مشرق کی کشمکش کے یہ عناصر قاری کو متاثر کرتے ہیں لیکن ان کے معیار کا فیصلہ ادب کی خراد ہی پر ہوگا۔ رضاء الجبار نے اپنے بیشتر افسانوں میں خالص مغربی ماحول کو پیش کیا ہے۔ جہاں انسان مشین بن گیا ہے اور جہاں مذہب بھی ایک ''صنعت'' بن گیا ہے۔ رضاء الجبار کے افسانوں میں اس ماحول کے مختلف Shades ملتے ہیں۔ رتن سنگھ نے رضاء الجبار کے افسانوں میں موجود ان کیفیات کا بیان کرتے ہوئے ان کے موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''رضاء الجبار نے مغرب کے اس پرفن نظام کا بھی تجزیہ کرنا چاہا ہے جو کھلا استحصال کرتا ہے لیکن احساس نہیں ہونے دیتا اور جہاں مذہب بھی ایک ''انڈسٹری'' ہے جو دوسروں کی آزادی کو سلب کرنے کے لیے چلائی جارہی ہے۔ رضاء الجبار کے یہاں ان تمام مسائل کی قوس وقزح ملے گی۔ وہ اس کی مختلف جہات کو

ابھارتے ہیں۔ مغرب سے مطابقت صرف تارکین وطن کا مسئلہ نہیں مغرب کا مسئلہ بھی ہے۔اس لیے کہ مغرب کے لیے ضروری ہے کہ اگر اس کو زندہ رہنا ہے تو وہ بھی مشرق کو راس آئے۔ ایک کا دوسرے کو راس نہ آنا الجھاوؤں کا کیا گیا سامان پیدا کرتا ہے۔ یہ خاصا دلچسپ ہے۔ رضاء الجبار مسلسل ان پہلوؤں پر لکھتے اور سوچتے رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ باہر کے دوسرے مصنفین نے ان مسائل پر نہیں لکھا لیکن لکھنے والوں کی وے ویںگتھ شاید الگ الگ ہے''۔

(رضاء الجبار کی کہانی)

رضاء الجبار کا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ادیب اور فنکار کے ذہن وفکر میں بھی تبدیلی آتی ہے اور اس کے موضوعات بھی زمانے کے حساب سے بدلتے رہتے ہیں۔

رضاء الجبار نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جہاں انہوں نے ہندوستان کی تہذیب، ثقافت، اساطیر اور طبقیاتی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ ''سائیکولوجی'' اور ''صبر کا پھل'' کرداری افسانے ہیں جس میں سماجی حقیقت کو موضوع بنایا ہے۔ ''سائیکالوجی'' افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی۔ اس میں بے روزگاری کے مسئلہ کو نفسیاتی سطح پر سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس طرح سماجی حقیقت نگاری ان افسانوں میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔

''سائیکالوجی'' کی کہانی سلمٰی کے کردار کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے اور اسی کے وسیلہ سے دوسرے کردار افسانے میں سامنے آتے ہیں۔

''فرمان علی''، سلمٰی کے والد ہیں جن کی انجینئرنگ فیکٹری ہے۔ دولت مند آدمی ہیں اور بڑی ٹھاٹ سے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ شام کی چائے پی رہے ہیں کہ اسی وقت ایک خط ان کے نام آتا ہے۔ خط لکھنے والے کا نام محمد باقر حسین، عمر 28 سال ہے۔ خط دراصل ایک درخواست ہے کہ وہ بے روزگار ہے اور اسے فرمان علی کی فیکٹری میں عارضی طور پر ہی صحیح ملازمت دی جائے۔ باقر حسین کے دونوں ہاتھ نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے بنے ہوئے مصنوعی ہاتھ ہیں۔

جب سلمٰی خط پڑھتی ہے تو بیگم فرمان علی کی ساری ہمدردی باقر حسین سے ہو جاتی ہے۔ باقر حسین کی معذوری کو جان کر وہ سلمٰی کو خط آگے پڑھنے سے روک دیتے ہیں۔اس ساری ہمدردی کے بعد طے یہ پایا جاتا ہے کہ ''زکوٰۃ'' میں سے دو سو ایک (201) روپے باقر حسین کی مدد کے لیے منی آرڈر کیا جائے۔افسانہ کی کہانی اس مقام پر آنے کے بعد یکدم سے بدل جاتی ہے۔اب افسانہ کا مرکز سلمٰی بن جاتی ہے۔ باقر حسین کو بطور امداد منی آرڈر کرنے کے بارے میں سلمٰی اپنے والد سے کہتی ہے:

> ''ڈیڈی''، سلمٰی نے پھر کہا ''یوں خیرات کے طور پر پیسے دینے سے کبھی احساس مجروح ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسے لوگوں کے جو اپنی عزت آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اس آدمی کو نہیں دیکھا ہے اس لیے میری رائے ہے کہ آپ ایک خط لکھ کر اسے انٹرویو کے لیے بلا لیجئے۔ اسے تسلی بھی ہوگی تب بات چیت کے دوران آپ پتہ چلائیے کہ اگر آپ اسے پیسے دینا چاہیں تو کیا وہ قبول کرے گا؟ آپ اس کا مشاہدہ کریں ورنہ کوئی کام لے کر یہ رقم اسے معاوضہ کے طور پر دے دیں''۔ خیال بہت مناسب ہے۔فرمان علی نے جواب دیا۔

باقی دو افراد نے بھی حامی بھری''۔

(افسانہ ''سائیکالوجی'')

سلمٰی جو سائیکالوجی کی طالبہ ہے اپنے والد سے یہ مکالمہ اس لیے کہا کہ وہ باقر حسین کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچنے سے بچانا چاہتی تھی۔ سلمٰی کے منصوبے کے مطابق مقررہ دن باقر حسین، فرمان علی کے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ باقر حسین کو انٹرویو کے لیے مدد کرنے کے پیچھے سلمٰی کا اپنا ایک مقصد ہے۔ یہ مقصد افسانے کے اختتام پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ عین اس وقت جب فرمان علی باقر حسین کا انٹرویو لے رہے ہیں اور بڑی دلچسپی سے مصنوعی ہاتھوں سے اسے لکھتے اور کام کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ سلمٰی کا حادثہ ہو گیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دونوں ہی گھر کے اندر داخل ہوئے ان کا اور سلمٰی کا آمنا سامنا ہوا۔ لیکن سلمٰی اچھی تھی ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں سے لبریز چہرہ تھا۔ اس کے جسم پر کسی حادثے یا کسی زخم کا کوئی پتہ نہیں دے رہا تھا۔ فرمان علی کے اوپر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان کا ذہن ایک بدلتی ہوئی کیفیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے اپنے ذہن کو مجبور کیا تھا کہ جو کچھ سنا ہے اسے وہ مان لے۔ اب وہ ذہن کو پھر پچھلی پوزیشن پر لے جا رہے تھے۔ خاموشی توڑ کر فرمان علی سنجیدگی سے بولے۔ تم اچھی ہو۔ خدا کرے کہ تم اچھی ہی رہو۔ کسی نے غلط اطلاع دے کر میرے ہوش اڑا دیے تھے۔'' کار کے حادثے میں میرے اپاہج بن جانے کی اطلاع نا ڈیڈی''؟

''میں سخت فکر مند تھا۔ اپاہج بن کر زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی مسئلہ، کوئی مشکل یا کوئی بات نہیں۔ مجھے فکر اپنی زندگی کے بعد والی تمہاری زندگی کی تھی؟''

سلمٰی ہنسنے لگی۔ ڈیڈی وہ جو باقر حسین آپ کے یہاں انٹرویو کے لیے آئے ہیں نا ان کے والدین بھی اسی فکر میں گھل رہے ہوں گے کہ ان کا خیال کون رکھے؟''

(افسانہ ''سائیکالوجی''، افسانوی مجموعہ ''روشنی کی کرن'')

اور اس طرح سلمٰی اپنے والد بزرگوار پر سائیکالوجی کے ایک نکتہ کو آزماتی ہے اور اس کے ذریعے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرتی ہے۔ وہ اپنے حادثے کی خبر دے کر دراصل اپنے والد میں باقر حسین سے متعلق ہمدردی کے جذبات کو ابھارنا چاہتی ہے۔

''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' رضاء الجبار کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' کے اکثر افسانے کرداروں پر مبنی ہیں۔ ان افسانوں کو ہم پیکارسک تکنیک کے افسانے نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ ان افسانوں میں دوسرے کرداروں کے وسیلہ سے پلاٹ کی تعمیر نہیں کی گئی ہے۔

''وٹامن کی گولیاں'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے جو اس کے کردار ''جارجٹا'' کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ واحد متکلم جارجٹا کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ کہانی کینڈا کے شہر اوٹوا سے شروع ہوتی ہے اور مونٹریال تک پہنچتی ہے۔

واحد متکلم ''مارٹن'' کی ملاقات جارجٹا سے ''اوٹوا'' کے ایک ریسٹورنٹ میں ہوتی ہے۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے متاثر ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے دونوں کے تصادم کے لیے اس ریسٹورنٹ میں ''دوپہر کے کھانے'' کے وقت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مارٹن عمر رسیدہ ہے اور ''جارجٹا'' بھی تقریباً 75 سال کی خاتون ہے لیکن اس کی

مسکراہٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابھی جوانی کی سرحد پار کی ہو۔ مارٹن اسے ہر روز تازہ، تازہ بنائی ہوئی چٹپٹی گرم گرم مسالہ دار چیزیں کھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ دونوں میں کوئی شناسائی نہیں۔ ایک دن جب مارٹن اس ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے جاتا ہے تو اسے جارجٹا نظر نہیں آتی۔ وہ ریسٹورنٹ میں کام کرنے والی لڑکی ڈورین سے پوچھتا ہے کہ جارجٹا کیوں نہیں آئی؟ ڈورین بتاتی ہے کہ وہ دو دن سے نہیں آئی۔

افسانہ یہاں سے ایک نیا موڑ لیتا ہے اور جارجٹا کی غیر حاضری ہی مارٹن کو اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے:

''لیکن جارجٹا کی آنکھوں میں چمک تھی اور
اس کے ہونٹوں پر جو شاداب مسکراہٹ نمودار
ہوا کرتی تھی، ان کی نوعیت ہی الگ تھی''۔
(وٹامن کی گولیاں)

مارٹن کا جارجٹا کے بارے میں سوچنا دراصل انسانی فطرت کے اس وصف کو سامنے لاتا ہے جہاں ہم کسی چیز سے محروم ہونے کے باعث اس کے قائل ہو رہے ہیں۔ مارٹن کی جارجٹا میں دلچسپی اس لیے بھی ہے کہ اس نے وٹامن بنانے والی ایک ایجنسی لی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جارجٹا کی حرکیاتی رفاقت سے فائدہ اٹھائے اور اس کو ان وٹامن کی گولیوں کی مارکیٹنگ کے لیے ملازم رکھ لیں۔ لیکن اسی دن جارجٹا لنچ کے لیے نہیں آئی۔ تب مارٹن ڈورین سے جارجٹا کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ریسٹورنٹ کا منیجر مارٹن کو بتاتا ہے کہ تیس برس سے جارجٹا ہر روز دوپہر کا کھانا اسی ریسٹورنٹ میں کھاتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ تیس سال پہلے اس کا بڑا بھائی اسٹیفن اس ہوٹل کا منیجر تھا اور اس نے پچیس برس تک جارجٹا کو اس ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا پابندی سے کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ ساری تفصیل افسانے میں بظاہر زائد یا اضافی معلوم ہوتی ہے لیکن افسانہ نگار نے پلاٹ کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ تمام روداد بیان کی ہے۔ پچیس سال مسلسل ایک ہوٹل میں ہر روز دوپہر کا کھانا اس بات کی علامت بن جاتا ہے کہ یہ کردار صحت مند ہے۔ مضبوط قویٰ کا مالک ہے۔ چونکہ مارٹن وٹامن کے گولیوں کی مارکیٹنگ کے لیے جارجٹا کا انتخاب کرتا ہے اس پس منظر میں یہ تفصیل، افسانہ کا عیب نہیں بلکہ ہنر بن جاتی ہے۔

کہانی اس مقام تک پہنچتی ہے تو اس میں ایک اور نیا موڑ آتا ہے اور افسانے کے آخر کا یہی موڑ افسانہ کا مرکزی خیال ہے اور اسی نکتہ کے اطراف افسانہ نگار نے اپنی کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔

''وٹامن کی گولیاں'' کے مرکزی خیال سے جو اہم نکتہ ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ فطرت کی تابعداری انسانی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ افسانہ نگار چونکہ مشرق کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے اور مغرب فطرت کے بجائے سائنس اور ٹکنالوجی پر انحصار کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی فنکاری کے ساتھ جارجٹا کے کردار کے ذریعہ اپنے موضوع کو نتیجہ خیز بنایا ہے۔ رضاء الجبار نے اپنے افسانے ''کھلا ہوا دروازہ'' میں بھی مغربی تہذیب کے عصری نقوش اور مشرقی تہذیب کے اقدار کا احاطہ کرتے ہوئے افسانے کے اختتام کو دلکش بھی بنایا اور سبق آموز بھی۔ ''کھلا ہوا دروازہ'' نارتھ امریکہ کے شہر وینی پیگ کے ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے جو انسانی رشتوں پر اپنے پالتو جانور کو ترجیح دیتا ہے۔

''شگاف'' رضاء الجبار کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انہوں نے مشرق سے موضوع منتخب کیا ہے۔ افسانہ میں ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' کے دوسرے افسانوں کے برخلاف رومانی فضاء ملتی ہے۔ اس میں رضاء الجبار نے پریتی اور ہربیل کے کردار پیش کیے ہیں۔ افسانے کی رومانی فضاء کو پر تاثر بنانے کے لیے

انہوں نے کہانی کو حسین مناظر سے ہم آہنگی فراہم کی ہے۔

اس افسانہ میں رضاء الجبار نے ہندوستانی اساطیر سے کردار اخذ کیا ہے۔ چنانچہ ہربیل اور پردیپ کے ساتھ ساتھ شگاف بھی اسی اساطیر کا حصہ ہے۔ پریتی ہربیل سے محبت کرتی ہے، ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ پردیپ، ہربیل کا دوست ہے۔ پورنیما کی رات پریتی اور ہربیل شادی کرنے والے ہیں۔ دونوں کھنڈالہ کے چھوٹے سے میدان میں ملتے ہیں۔ دونوں ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھے اپنے مستقبل کے حسین سپنوں میں کھوئے ہوئے ہیں کہ ہربیل چٹان سے چند گز کے فاصلے پر جنگلی پھول کے پودے سے پھول توڑ کر پریتی کو پیش کرنا چاہتا ہے لیکن پھول توڑتے ہوئے توازن کھونے کے باعث شگاف میں گر جاتا ہے۔ افسانے کی ابتداء اس حادثہ کے ٹھیک ایک سال بعد کی کہانی سے ہوتی ہے۔ کھنڈالہ کے چٹان کا منظر بیان کرنے کے بعد پریتی قارئین کے سامنے آتی ہے۔

''پریتی آہستہ آہستہ چٹان کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ چٹان کے قریب آئی تو اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ میری راتوں کے چاند! تمہیں روپوش ہوئے ایک برس ہوگیا۔ یہی سرد پورنیما کی رات تھی، ایک برس بعد جو آج آئی ہے۔ گزشتہ سال میرے ساتھ تم تھے ہربیل! اس رات میرے سر کا تاج بننے کی قسم کھائی اور اسی رات تم نے مجھے جدائی کا داغ دے دیا''۔

(شگاف)

اس اقتباس میں پریتی کا چٹان کے قریب آکر سسکیاں بھرنا ہربیل کو میری راتوں کے چاند قرار دینا پورنیما کی رات اور سر تاج بننے سے پہلے جدائی کا داغ دینا کہانی کے تمام تر اہم رخ کو پیش کرتا ہے۔

کہانی صرف اتنی ہے کہ پریتی اور ہربیل دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کی غرض سے کھنڈالہ کے میدان میں اکٹھا ہوئے ہیں۔ جنگلی پھول توڑنے کی کوششوں میں وہ چٹان سے پھسل کر شگاف میں گر جاتا ہے۔ پریتی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ آج ایک سال بعد وہ پھر اسی میدان میں چلی آئی ہے۔ اپنے آپ خود کلامی کے انداز میں اپنی اور ہربیل کی محبت کی داستان بیان کر رہی ہے کہ ایسے میں ایک سایہ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ ہربیل کا دوست پردیپ ہے۔ وہ پریتی سے کہتا ہے کہ وہ ہربیل ہے۔ پریتی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں، وہ کہتی ہے کہ تم پردیپ ہو اور میرا غم کم کرنے کے لیے اس طرح خود کو ہربیل بتا رہے ہو۔ ہربیل پردیپ کے روپ میں موجود ہربیل پریتی سے بدن اور آتما کے تعلق اور آتما کی اصلیت کا مثالوں کے ساتھ بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جسم پردیپ کا ہے لیکن اس میں جو آتما قید ہے وہ ہربیل کی ہے۔ پریتی نہیں مانتی تب پردیپ کہتا ہے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہاں! ماضی اور حال کے درمیان ایک شگاف ہے۔ میری آتما کے کھو جانے کی بات ایک تسلسل میں شگاف کی طرح ہے۔ میں اس خلاء کو بانٹنے کے لیے گزشتہ سال کی باتوں کو یاد کروں گا۔ میں کہتا جاؤں گا اور تم سنتی چلی جانا۔ میں جھوٹ بولوں تو تم ٹوک دینا۔ میں کہتا ہوں کہ تم ایک بار بھی نہیں ٹوک سکوگی''۔

(شگاف)

ہربیل اسے ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ ماضی کا ایک ایک واقعہ، ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل ہربیل پریتی کے سامنے دہراتا ہے۔ ہربیل بتاتا ہے پھر پریتی کا لکھا ہوا گیت گانے لگتا ہے۔ پریتی بے ساختہ اس کی آواز میں آواز ملانے لگتی ہے۔ گیت ختم ہوتا ہے تو

ہربیل کہتا ہے:

''گیت کے اختتام پر تم نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا تھا''۔ ''آتما کی باتوں میں جھوٹ نہیں ہوتا ہے نا؟ پریتی نے آہستہ سے اپنا سر اس ہربیل کے کندھے پر رکھ دیا''۔

(شگاف)

پریتی اپنے پیار کو پہچان جاتی ہے اور اب اسے ہدایت کرتی ہے کہ شگاف کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ چاند آہستہ آہستہ دونوں کے سر پر آجاتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ گزشتہ برس کی طرح اس سال بھی کوئی کھائی میں گرا۔

''اس بھیانک شگاف کی دوسری جانب دور سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگوں نے کہا کہ گزشتہ سال کی طرح اس برس بھی عین چاند سروں کے اوپر تھا ایک لاش اس کھائی میں گری۔ چند سیکنڈ تک وہ روشنی میں چمکتی ہوئی کئی سو فٹ کی بلندی سے گرتی ہوئی دکھائی دی اور لاپتہ ہوگئی۔ ہاں ایک دل سوز چیخ کی آواز بہت دیر تک بہت دور سے آتی رہی''۔

(شگاف)

رضاء الجبار نے اس افسانہ میں افسانہ کے فن پر اپنے عبور کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔

شگاف کے موضوع کی طرح رضاء الجبار نے اپنے افسانے ''کوے'' میں بھی اساطیر سے موضوع منتخب کیا ہے۔ اس افسانہ میں اونچا مینار لاتعداد ''کوے'' مینار کا رکھوالا اور ایک سیاح کا کردار ملتا ہے۔

ہندوستان کے قصوں اور حکایتوں میں اکثر یہ بیان ملتا ہے کہ کوئی انسان مرنے کے بعد کوا بن گیا یا کوے بھی کبھی انسان تھے۔

سیاح واحد متکلم ہے اور کہانی بیان کر رہا ہے۔ یہ کردار افسانے کا واحد کردار ہے۔

رضاء الجبار کے افسانوں میں اپنے موضوع کی ندرت کے اعتبار سے یہ افسانہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ''روشنی کی کرن'' سے ''سنگ اٹھانے کا حوصلہ'' تک رضاء الجبار کے فن میں مسلسل ارتقاء نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''دراز دراز مہیب سائے'' ہے۔

''دراز دراز مہیب سائے'' رضاء الجبار کا ایک ایسا افسانہ ہے جو دراصل ایک تمثیل ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار دو ہیں۔ مالک اور غلام۔ ماقی دوسرے کردار کہانی کو مکمل کرنے کے لیے ضمنی طور پر سامنے آتے ہیں۔ کہانی یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کو نیند سے اٹھاتا ہے اور اسے ''نئی دنیا'' کا سفر اختیار کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسے ایک ہار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نئی دنیا سے ہمارے لیے بہترین چیز منتخب کرو اور یہ ہار پہنا کر ہمیں پیش کرنا غلام حامی بھر لیتا ہے۔ اپنے مالک کے سامنے حامی بھرتے ہوئے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور جب آنکھیں کھولتا ہے تو خود کو ایک بڑے ہوائی جہاز سے باہر نکلتا ہوا دیکھتا ہے۔ اپنے اس سفر میں غلام مالک کے لیے بھی جہاز کو بطور تحفہ لے جانے کے لیے سوچتا ہے تو کبھی خوبصورت اور خوشنما کار بطور تحفہ لے جانے کے بارے میں سوچتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک عدالت میں پہنچتا ہے جہاں کا جج بڑا منصف مزاج ہے۔ غلام سوچتا ہے کہ جج کو مالک کے لیے لیتا چلیں یہ غیر معمولی آدمی ہے لیکن جب جج کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد پھر سفر پر روانہ ہوتا ہے اور اس اثناء میں وہ ٹرین کا سفر کرتا ہے اور اسے یہ سفر پسند آتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد غلام اپنے اس خیال کو بھی خیر آباد کہہ دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جس نئے شہر میں موجود تھا وہاں بہت ساری ایسی چیزیں تھیں جسے انسان نے اپنے ذہن کی زرخیزی کی وجہ سے ایجاد کی تھیں۔ چنانچہ وہ سوچتا ہے کہ کیوں نہ اپنے مالک کے لیے

بیسویں صدی کے ایک انسان کا انتخاب کریں جو مالک کے لیے بہترین تحفہ ہوگا۔

افسانہ کا اختتام رضاء الجبار نے غلام کی التجا پر کیا ہے کہ جو وہ اپنے مالک سے کر رہا ہے اقتباس دیکھئے:

''اب وہ بوڑھا دنیا میں واپس لوٹنے کی طاقت کھو چکا ہے۔ خوف کے مارے وہ لرزنے لگا۔ میرے مالک آپ بڑے مہربان اور رحم کرنے والے ہیں۔ دنیا کا بہترین نمونہ سمجھ کر میں نے ایک انسان کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کے شیطان اس پر اس طرح غالب آجائیں گے کہ انسان کا وجود ہی ختم ہوجائے گا اور وہ باقی رہ جائیں گے۔ میں دھوکہ کھا گیا''۔

(دراز دراز مہیب سائے)

یہ بڑا معنی خیز اختتام ہے۔ غلام کا یہ اعتراف کہ میں نے شیطان کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ دراصل انسان موجودگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ انسان بالآخر ہر چیز پر فتح پائے گا۔

رضاء الجبار کے افسانوں کے کردار جدوجہد عزم اور شفاف نقطۂ نظر کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ حالات سے شکست نہیں کھاتے بلکہ حالات کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

رضاء الجبار اپنے زبان اور لہجہ کے ذریعہ اپنے کرداروں کے عزم و حوصلہ کو واضح نہیں کرتے بلکہ کہانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کا حوصلہ اور عزم ابھر کر سامنے آتا ہے۔

رضاء الجبار، الفاظ سے خوب کھیلتے ہیں اور جزئیات نگاری اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا موقلم بلونے لگتا ہے۔

کرشن چندر نے رضاء الجبار کے افسانوں کے پہلے مجموعہ ''روشنی کی کرن'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے افسانوں کی زبان و بیان اور جزئیات کی داد دی ہے۔

''زبان و بیان کے معاملے میں رضاء الجبار بے حد محتاط واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں وہ افراط مبالغہ اور طولانی کے قائل نہیں۔ زبان رواں لیکن پلاٹ چوڑا نہیں۔ منضبط اور مربوط نثر لکھتے ہیں جو کہانی کے ساتھ گویا چپکی ہوئی اور منڈھی ہوئی آخر تک چلی جاتی ہے۔ کہیں پر جھول، بے محل افکار یا فالتو گفتگو کا احساس نہیں ہوتا''۔

(افسانوی مجموعہ: روشنی کرن)

یہ رضاء الجبار کے فن کے لیے سب سے بڑی سند ہے۔ کرشن چندر نے اپنی بات کی سند میں ان افسانوں کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں جو قاری کی نگاہ میں نگینوں کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''آپ کسان کی طرح جھومیئے میں فصل کی طرح لہراؤں گی''۔

(افسانہ تیسرا صفحہ)

بھابی میں آپ کو بچانے کے لیے ڈوب سکتا ہوں۔ آپ کو لے کر ڈوبنا تو بہت دور کی بات رہی''۔

(افسانہ پندرہ سال بعد)

کرشن چندر نے دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی پیش کردی ہے۔ انہوں نے یہ رائے رضاء الجبار کے پہلے افسانوی مجموعے پر لکھی تھی جو کہ 1973ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن آج بھی ہم ان کے افسانوں میں یہی خوبی پاتے ہیں۔

آخر کار افسانوی ادب کا یہ جگمگاتا ہوا ستارہ اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں 31/جنوری 2011ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

☆☆☆

غلام نبی کمار

مضمون

ڈاکٹر عباس رضانیر کی تنقیدی بصیرت

لکھنؤ اردو زبان وادب کا قدیم گہوارہ کہلاتا ہے۔ نیز اسے مشرقی تہذیب وتمدن کی آما جگاہ بھی کہا جاتا ہے۔لکھنؤ اتر پردیش کے اس خطے میں واقع ہے جسے ماضی میں اودھ کہا جاتا تھا۔لکھنؤ کو کثیر الثقافتی شہر بنانے میں یہاں کے نوابوں اور حکمرانوں کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ ان نوابوں اور حکمرانوں نے نہ صرف تواریخی عمارتیں،خوبصورت محلات اور دلکش باغات تعمیر کیے بلکہ تہذیب و ثقافت،فنونِ لطیفہ ،موسیقی،زبان و ادب اور خصوصاً شاعری کرنے والوں کی خوب پذیرائی کی۔ یہاں کے امراء اور نوابین نہ صرف شاعری کے دلدادہ تھے بلکہ خود بھی شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔اردو زبان کے بڑے بڑے شعرا کو انھوں نے اپنا استاد بنایا اور انہی کی سرپرستی میں اپنے شعری ذوق وشوق کو پروان چڑھاتے رہے۔چونکہ انہیں ہر قسم کی آسائش میّسر تھی اور ہر اعتبار سے ان کی زندگی رنگین طبع تھی۔مصیبت اور غم واندوہ زندگی سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اس لئے ان کی شاعری میں سطحیت اور خارجیت کے عناصر نمایاں ہوئے۔ان کے استاذ اور درباروں سے تعلق رکھنے والے شعرا بھی اس رنگین طبع زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور صلہ واکرام پانے کی غرض سے اور ساتھ ہی اُس وقت کے ماحول کے زیر اثر بھی ان کی شاعری میں سطحی اور خارجی عناصر کا پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ یہاں کے ادبا وشعرا نے ایک مخصوص اسکول کے تحت اپنے خیالات ونظریات کی ترویج کی اور اسے اپنی تخلیق کے ذریعے سے فروغ دیا۔اسی اسکول کو بعد میں دبستانِ لکھنؤ کا نام دیا گیا۔لکھنؤ کے برعکس دہلی میں بالکل اس کے مترادف شاعری ہورہی تھی جس میں داخلیت کا اثر تھا اور جسے دبستانِ دہلی کا نام دیا گیا۔ان دونوں دبستانوں میں دو الگ الگ قسم کے نظریات وجود میں آنے کی وجوہات اس وقت کے ماحول کی کارفرمائی تھی۔مذکورہ دبستانوں نے اردو ادب کو کافی متاثر کیا تھا۔لیکن وقت گذرتا گیا،حالات بدلتے گئے، نئے تقاضے سامنے آئے اور نئے نئے ادبا وشعرا اور ناقدین کی آمد ہوئی۔اس طرح اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ آج کے لکھنوی شعرا اور ناقدین حضرات کی طرزِ تحریر کا ایک اپنا مخصوص رنگ ہے۔جو کسی مخصوص نظریاتی رجحان کے دائرے میں مقیّد نہیں ہے۔لکھنؤ نے اردو کے شہرت یافتہ شاعروں اور ناقدین کو جنم دیا ہے۔انہی شاعروں اور نقادوں میں ایک نام ڈاکٹر عباس رضانیر کا ہے۔عباس رضانیر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو برسوں سے ادب کے ایک اہم خدمت گزار کی حیثیت سے بےلوث ہوکر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔عباس رضانیر ایک اچھے انسان اور مدرس تو ہیں ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بہترین ناظم،شاعر،مترجم اور مرتب بھی ہیں۔ان کے مختلف تنقیدی وتجزیاتی مضامین ملکی اور غیر ملکی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں اور میرا بنیادی مقصد یہاں پر صرف ان کی تنقید نگاری بیان کرنے سے ہے۔ عباس رضانیر کی حال ہی میں تین تنقیدی وتجزیاتی مضامین کی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں'' تنقیدیں بحثیں''،''رثائی تنقیدیں'' اور''خواجہ احمد عباس'' شامل ہیں۔ان کتابوں کے تناظر میں اور اس کے علاوہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کے مقدموں سے بھی ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔

''تنقیدی بحثیں''(2016) میں عباس رضانیر کے تیرہ(۱۳) تنقیدی وتجزیاتی مضامین شامل ہیں۔یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف النوع موضوعات پر بین الاقوامی اور قومی سطح کے سمیناروں میں پڑھنے کی غرض وغایت سے لکھے گئے تھے جو بعد میں

مؤقر ادبی جرائد میں شائع ہوکر قارئین حضرات سے دادِ تحسین بھی وصول کر چکے ہیں۔عباس رضا نیر کافی عرصے سے درس و تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔تاہم اس دوران انھوں نے ادب کو اپنے قلم سے گرمایا بھی ہے اوراس کی لذت و چاشنی سے تسکین یاب بھی ہوئے ہیں۔اس کتاب کے انتساب کو انھوں نے اردو زبان کے مایہ ناز ادیب اور ناقد پروفیسر شارب ردولوی کے نام معنون کیا ہے۔ابتدائیہ میں شامل کتاب مضامین کے حوالے سے مختصر لیکن کارآمد گفتگو کی ہے۔

''تنقیدی بحثیں'' میں عباس رضا نیر نے بعض کلاسیکی اور جدید شاعروں،افسانہ نگاروں اور صحافیوں پر مضامین کے ساتھ ان کی غزلوں،نظموں،افسانوں،ناولوں اور دوسرے تخلیقی سرمایوں کا تجزیہ اپنے فنی و فکری اور بلیغ و عمیق نقطہ نظر کی بنیاد پر کیا ہے۔موصوف کے مطابق ''پیشِ نظر تنقیدی مضامین میں فن پاروں کو قاری کے تاثرات اور تخلیق کار کی ذاتی زندگی یا سماجی اور تاریخی پس منظر کی بجائے براہ راست متن سے رشتہ استوار کیا گیا ہے اور متن کے سیاق و سباق کے حوالے سے فن پاروں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' یہ بات واضح رہے کہ عباس رضا نیر ایک معتبر پارکھ بھی ہیں اور حقیقت پسند تنقید نگار بھی۔اس کتاب میں شامل مضامین سے اس بات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہوگا۔

''بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں'' اس کتاب کا اوّلین مضمون ہے۔جس میں عباس رضا نیر نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفؔر کے دورِ اقتدار اور ان کے ادبی کوائف کا تجزیہ اور محاکمہ موثر انداز میں کیا ہے۔عہد ظفؔر کے خارجی خلفشار اور داخلی انتشار کی جو تصویریں ہمیں میؔر و غالبؔ اور ذوقؔ و سوداؔ کے یہاں نظر آتی ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ پہلو ظفؔر کی شاعری میں نمایاں ہوا ہے۔اس کے علاوہ سماجی انتشار اور سیاسی خلفشار جیسے عناصر قطع نظر ظفؔر کے نہ ان کے ماقبل اور نہ مابعد کے شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔یہاں تک کہ ان کے معاصرین کی حیثیت بھی ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں تماشائی سے زیادہ کی نہیں ہے۔اس مضمون کے ابتدائی صفحات میں جہاں ظفؔر کے عہد، ان کے دورِ اقتدار، ان کی زندگی، ان کی حالتِ زار، ساتھیوں اور ہم عصروں کی بے اعتنائی، مسائل و مصائب سے دوچار ہونے کے علاوہ اور ان کی درد بھری زندگی کے احوال آشکار ہو جاتے ہیں۔وہیں باقی صفحات میں ان کی ادبی زندگی کا تفصیلی تجزیہ ان کی غزلیات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔یہ بات عیاں ہے کہ کلامِ ظفؔر اُس عہد کی آئینہ سامانی کرتا ہے۔ان کا شعری اسلوب اپنے عہد کے شعرا سے بہر نوع مختلف ہے اور ان کا لہجہ بہر حال اپنا ہے۔لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جہاں غیروں نے ان پر ستم کیے وہیں ان کے اپنوں نے بھی نباہ نہ کی۔کسی نے کہا ان کا آدھا دیوان شاہ نصیر کا ہے، کسی نے کہا کہ ان کا آدھا کلام غالب کا ہے۔یہاں تک کہ ان کی معروف غزلوں کو بھی دوسرے شعرا سے منسوب کیا گیا۔ان سب باتوں کا تذکرہ مصنف نے نہایت غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے۔مصنف نے ظفؔر کے جن تین غزلوں کا تجزیہ کیا ہے اور گہرائی میں جا کر ان کی تفہیم و تعبیر پیش کی ہے ان کے مطلعے یوں ہیں:

؎ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

؎ رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا

؎ لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں

مندرجہ بالا میں ظفؔر کی معروف ترین غزلوں کے مطلعے پیش کیے گئے ہیں۔یہ غزلیں ان کی بے مائیگی و بے بضاعتی، شکست و ریخت، مایوسی و نا اُمیدی، محرومی و محزونی، بے چینی و دل آزاری، یاس و غم اور رنج و تعب کی عکاس ہیں۔ظفؔر کی لاچاری اور شکستگی سے ان کی شاعری میں متصوفانہ رنگ آمیزی نے جنم لیا۔ان کی شاعری حزنیہ عناصر سے مزین ہے۔عباس رضا نیر کے بقول بہادر شاہ ظفر کی شاعری نہ کہیں سے درآمد ہے نہ کسی سے استفادہ۔

بلکہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری اور یجنل شاعری ہے۔اس پورے مضمون میں مصنف کا عالمانہ اور مفکرانہ اندازِ پہلونمایاں ہوتا ہے اور ان کی فکری وفنی بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔دوسرا مضمون ''جہدِ آزادی اور مسدسِ افق'' پر لکھا گیا ہے۔جس میں موصوف نقاد نے انیسویں صدی کے ایک اہم مفکر شاعر منشی دوارکا پرشاد افق کے ۸۴ بند پر مشتمل ''مسدسِ افق'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔یہ مسدس شری دین دیال جی کی تحریک ''دھرم مہا منڈل'' سے متاثر ہو کر ان کی موومنٹ کی ستائش میں لکھا گیا تھا۔افق جس دور میں ادبی افق پر نمودار ہوئے وہ دور ہندوستان پر انگریزوں کی تسلط کا زمانہ کہلاتا ہے۔چونکہ افق بیدار ذہن اور حساس شاعر تھے۔اس لئے قوموں کی بیداری اور غفلت کی نیند سور ہے سماج کو متحرک کرنے کے لئے انھوں نے اپنی شاعری کو وسیلہ بنایا۔''مسدسِ افق'' اس کی بہترین مثال ہے۔اس مسدس کی تجزیہ نگاری میں عباس رضا نیر نے اُس زمانے میں ملک وملّت کی بے حسّی، بدگمانی، ظلم و جبر، زبانوں کی اہمیت سے ناشناسی اور تہذیب و ثقافت کی اہمیت سے ناآشنائی وغیرہ کو بڑی ہنرمندی سے واضح کر دیا ہے۔انھوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن، جغرافیائی خدوخال، علوم و فنون، موسموں و تہواروں، مذاہب، مقدس کتابوں وغیرہ کی اہمیت سے بھی قاری کو آشنا کرایا ہے۔ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان پر افق کی قوت اس تجزیاتی مضمون سے نمایاں ہو جاتی ہے۔تنقیدی مضمون ''اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر: فراق'' میں ابتداً ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت، ملک کی سالمیت اور ہندو مسلم اتحاد کی علمبردار زبان کے فروغ میں مختلف ادبا کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ تنقید نگار نے فراق کی آسیب زدہ اور مصائب و آلام میں گھری گھریلو اور ازدواجی زندگی کی داستانِ زیست بھی رقم کی ہے۔علاوہ ازیں فراق کے مختلف اشعار کا تجزیہ کرنے پر انھوں نے فراق کی شاعری میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں، غم سے اُبھرنے کا حوصلہ، نئی تعمیر کا خواب، گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری، ہند کی مٹی سے لگاؤ، تاریخ اور دیومالائی عناصر کا ذکر، جمالیاتی فضا، سوز وگداز، موسیقیت اور غنائیت وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔''ہند، فارس اور ن۔م۔راشد: ایران میں اجنبی'' کا تجزیہ اس کتاب کا ایک اور معلوماتی مضمون ہے۔جس کی تمہیدی گفتگو میں موصوف نے ایران کی تہذیب وتمدن، کلچر، صنعت وحرفت، شعبۂ ہائے فنون، فارسی شعر وادب، اردو کی فارسی زبان سے مستعار لی گئی فارسی لفظیات اور تراکیب کے ذکر کے علاوہ ایرانی تہذیبی وثقافتی اور سیاسی وسماجی انقلابات، فارسی زبان کا مشرقی ممالک پر اثر ونفوذ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔اس مضمون میں راشد کے نظموں کے مجموعے ''ایران میں اجنبی'' میں شامل تیرہ نظموں کا تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ان نظموں کے تناظر میں مصنف نے ایران پر برطانوی استعمار کے بہیمانہ سلوک، سماجی ومعاشرتی حالات، سیاسی وسماجی صورت حال، اشتراکی مظالم، جبر وآمریت، برطانوی سپاہیوں کی ہولناکیوں وغیرہ کو مؤثر انداز میں مرقوم کیا ہے۔''مجروح کی شعریات'' بھی ایک قابلِ مطالعہ مضمون ہے۔مجروح سلطان پوری بیسویں صدی کے شعرا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔جن کی شاعری میں جمالیاتی عنصر کی تلاش بالکل منفرد کام ہے۔مجروح کی شاعری جمالیاتی عنصر سے لبریز ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح'' کے شاعر کو صدیوں تک بھلایا نہ جائے گا۔اردو افسانوں میں پریم چند نے جس قدر دیہی زندگی کے مناظر اور کشاکش کو اپنے افسانوں میں برتا اور حقیقی طور پر اس کو زندگی بخشی، شاید ہی کوئی ان کے اس وصف میں ان کی ہمسری کر سکیں۔حالانکہ ان کے بعد کئی افسانہ نگاروں نے ان کا تتبع کیا لیکن پریم چند کا فن فنِ جاوداں ہیں۔عباس رضا نیر نے ''دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند کے افسانے پوس کی رات کا تجزیہ'' میں ایک دیہی کسان 'ہلکو' کے پس منظر میں دیہات کی افلاس زدہ زندگی نیز حادثات اور

حالات کے جبر سے جوجھتے ایک بے کس انسان کی درد انگیز کہانی کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔عباس رضا نیر کی مذکورہ کتاب کا یہ تنقیدی مضمون ''اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز'' بالکل منفرد حیثیت کا حامل ہے۔اس میں انھوں نے مرزا ہادی رسوا کی ادبی اہمیت بھی اجاگر کی ہے اور بنیادی موضوع کے حوالے سے فاضل ناقد لکھتے ہیں کہ درحقیقت اس ناول کا موضوع مٹتے ہوئے تہذیبی اثرات ہیں اور اگر اس بنیادی نقطہ نظر کو نظر انداز کیا جائے تو اختری بیگم کا شمار دوسرے درجے کے ناولوں میں بھی نہ ہو سکے گا۔انھوں نے ''اختری بیگم'' کے کرداروں کے ذریعے ادا کیے گئے مکالموں اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کے توسط سے ناول کے تہذیبی عناصر کو نمایاں کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔جس سے اس ناول کی اہم خوبیوں میں گِنا جا سکتا ہے۔اس کتاب کے دیگر تنقیدی مضامین میں ''قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ''، ''انتظار حسین اور ہجرت''، ''اردو صحافت کا مجاہد اول: مولانا باقر دہلوی''، ''اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد''، ''منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم'' اور ''بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب'' شامل ہیں۔قرۃ العین حیدر پر تصنیف کیے گئے مضمون میں عباس رضا نیر نے ان کے سات ناولوں اور ایک ناولٹ ''سیتا ہرن'' کے پس منظر، کرداروں، بیان کی گئی تہذیب و تاریخ کا نچوڑ، برتی گئی تکنیک، وسیع تر کینوس، ان کی وحدت اور ابعاد وغیرہ سے واقف کرایا ہے۔ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہی غالباً اردو افسانوں میں ہجرت کے موضوع کا وجود ہوا اور اس موضوع کی ابتدا اور انتہا انتظار حسین کے افسانوں میں جس قدر نظر آتی ہے، شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار کے افسانوں میں یہ کیفیت اتنی عروج کو پہنچی ہو۔انتظار حسین کے افسانہ ''کشتی'' کا تجزیہ ہجرت کے پہلو کو ہی مدِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔اس کتاب کے بقیہ تین مضامین میں اردو صحافت کے معماروں مولانا باقر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور منشی نول کشور کی صحافتی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ایک مضمون میں بیسویں صدی میں لکھنؤ کے اردو ادب کے نامور تخلیق کاروں کی تخلیقی صفات کی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔

''تنقیدی بحثیں'' عباس رضا نیر کے تنقیدی مضامین کا ایک اعلیٰ وارفع مرقع کہا جا سکتا ہے۔جس میں انھوں نے متقدمین کی تحریروں کا وسیع و وقیع تر تناظر میں مطالعہ کر کے ان کے مختلف ابعاد کا احاطہ اور پرت در پرت معلومات سے قاری کو نوازا ہے۔یہ مضامین انھوں نے پوری سوجھ بوجھ، فنی و فکری ندرت اور تخیلی اعتماد کی بنیاد پر تصنیف کیے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا شمار دورِ حاضر کے اہم اور معتمد قلمکاروں میں کیا جاتا ہے۔ان کی تنقیدی تصانیف سے ان کی سنجیدہ بیانی، عمیق انتقادی شعور اور استعدادی صلاحیت کا احساس بخوبی ہو جاتا ہے۔انھوں نے جہاں متقدمین ادبا و شعرا کو اپنا موضوع بنایا وہیں اپنے محبوب مرثیہ نگاروں کے شاہکار مرثیوں میں منفرد خصوصیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔''رثائی تنقیدیں'' میں انھوں نے اردو کے نامور ادبا و شعرا کی شاعری میں واقعاتِ کربلا سے متعلق مرقع عناصر نمایاں کیے ہیں۔انھوں نے کلاسیکی و جدید اردو شاعری میں ان تلازمات اور عناصر کو تلاش کرنے کی کامیاب سعیٔ بلیغ کی ہے۔

''رثائی تنقیدیں'' ڈاکٹر عباس رضا نیر کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کے ابتدائیہ میں انھوں نے مرثیہ کی اہمیت، صنف مرثیہ کے شمس و قمر کہلائے جانے والے انیس و دبیر کی شاعرانہ تعلّی کا اقرار، واقعات کربلا کا صنفِ مرثیہ کے علاوہ دیگر اصناف ادب میں علامتوں اور استعاروں کا اظہار اور کتاب سے متعلق اپنے تاثرات مرقوم کیے ہیں۔ابتدائیہ کے بعد ڈاکٹر منتظر مہدی نے کتاب سے متعلق اپنے تاثراتی مضمون ''رثائی تنقیدیں: ایک جائزہ'' میں کتاب کے متعلق اپنے وسیع و عمیق تر مطالعے کی

بنیاد پر ہر ایک مضمون پر انفرادی طور پر روشنی ڈالی ہے اور مصنف کی تنقیدی وتشریحی صلاحیت کا قابل فخر اعتراف کیا ہے۔

''رثائی تنقیدیں'' کے اوالذکر مضمون'' پیکر تراشی اور انیسؔ'' میں مصنف نے میر انیسؔ کے مرثیے ''جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا'' کے حوالے سے انیسؔ کے پیکر تراشی کے ملکہ پر گفتگو کی ہے۔ چونکہ یہ مرثیہ ۲۴۳ بندوں پر مشتمل ہے اس لئے بقول مصنف ''اگر پورے مرثیہ پر گفتگو کی جاتی تو مضمون طوالت اختیار کرتا''۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اس مرثیہ کے بہت سارے کرداروں میں صرف اس مرثیہ کے مرکزی کردار حضرت عباسؑ کی روشنی میں انیسؔ کی پیکر تراشی کی خصوصیت بیان کی ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انیسؔ نے اس مخصوص کردار کو اپنی لفظیات، استعارات اور تشبیہات کے ذریعے کس کس طرح کے پیکروں میں ڈھالا ہے۔ اس مرثیہ میں جہاں جہاں پر حضرت عباسؑ کا ذکر آیا ہے، چاہے وہ بلواسطہ طور پر آیا ہو یا بلاواسطہ طور پر اس کو زیرِ غور رکھتے ہوئے رضا نیز نے مرثیہ کی ہر پرت کھول کر حضرت عباسؑ کی اُن جملہ خصوصیات اور مزاجی کیفیات کو اجاگر کیا ہے جس سے انیسؔ نے مرثیے میں کہیں عباسؑ اور اس کے ساتھ دوسرے شہداء کے ذریعے ادا کیے گئے مکالموں، اس پر پیدا کیے گئے منظر نامے، اس کے عادات واطوار، اعمال وخصائص اور حرکات وسکنات وغیرہ کو مخصوص انداز میں برت کر پیکر تراشی کی ایک کامیاب صورت قارئین کے سامنے پیش کردی ہے۔ فاضل نقاد نے انیسؔ کے اس پیکر تراشی کے عمل کو زیادہ ترقوت اور حرکت حضرت عباسؑ اور اس کے تعلق سے ادا کیے گئے مکالموں سے بخشی ہے اور جہاں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے سہارے ایسا عمل انجام پایا ہے وہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ پیکر تراشی کے متعلق موصوف لکھتے ہیں:

''پیکر کی تشکیل میں سب سے اہم رول ماحول کے فطری پن، کردار کی وضع قطع اور مکالموں کے لب ولہجہ کے عین مطابق مزاج ہونے پر منحصر ہے اور انیسؔ اس فن سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنے کرداروں کی نشست و برخواست، حرکات وسکنات اقوال وافعال کی پیش کشی میں ہمیشہ لحاظ رکھتے ہیں۔''

دوسرے مضمون میں میر انیسؔ کے مرثیہ ''اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر'' کی روشنی میں انیسؔ کے کہانی پن پر دسترس اور بیانیہ پر ان کی فطری قدرت کو مرقوم کیا ہے۔ انیسؔ کو شہنشاہِ مرثیہ یونہی نہیں کہا جاتا۔ موصوف تنقید نگار کے مطابق انیسؔ نے کہانی کے فن کو اعتبار وعظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقیدل المثال ہے۔ انیسؔ اپنی فکری وفنی صلاحیتوں کی بنا پر تمام مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا میں انھوں نے کہانی سے متعلق بہت ہی دلچسپ اور معلوتی باتیں لکھیں ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کہانی اچھی ہو یا بری کہانی، کہانی ہوتی ہے اور دونوں صورتوں میں انسانی فکر کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اردو مرثیے میں کہانی نے کیسے جنم لیا؟۔ کچھ لوگ سوچتے ہوں گے کہ کربلا میں پیش آئے تاریخ ساز واقعات تو صداقت اور سچائی پر مبنی ہے تو اس میں کہانی کہاں سے آئی۔ درحقیقت اس مضمون میں اس موضوع پر سے پردہ اُٹھتا ہے۔ مرثیہ کے اس تجزیاتی مضمون میں درِحال شرین کی داستان تحریر کی گئی ہے۔ جو زوجہ حضرت امام حسینؑ حضرت شہر بانو بیگم کی کنیز تھیں۔ انیسؔ نے اس مرثیے میں اپنے جواہر قلم سے فن بیانیہ کے انتہائی حدود کا چھوا ہے۔ عباس رضا نیر نے انیسؔ کے اس مرثیہ میں پیدا کیے گئے کہانی پن اور بیانیہ پر ان کی قدرت کو بڑی فنکاری سے روشن کیا ہے۔ ''اسٹیج مکالمہ اور دبیرؔ'' میں دبیر کے معرکہ اور مقبول مرثیہ ''قید خانے میں طلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور مذکورہ مرثیہ کی رو سے اسٹیج اور مکالمہ کا تقابلی مطالعہ اور دبیرؔ کا ان دونوں تکنیکوں کو برتنے کے ہنر کو اجاگر کیا گیا

ہے۔ایک کامیاب ڈرامے میں جتنا رول اس کی کہانی، کرداروں اور ان سے ادا ہونے والے مکالموں کا ہوتا ہے اتنا ہی رول اس میں اسٹیج کا بھی ہوتا ہے۔اردو مرثیہ میں کہانی، اسٹیج اور مکالمے کے ساتھ جنھوں نے انصاف کیا بلکہ یوں کہیے کہ اس فن کو حدِ کمال تک پہنچایا ان کے نام انیسؔ و دبیرؔ ہیں جو اس افق کے آفتاب و مہتاب کہلائے۔عباس رضا نیر نے دبیرؔ کے شہرۂ آفاق مرثیے کا جو تجزیہ زیرِ نظر مضمون کے عنوان کی خوبیوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ایک مضمون ''جمیل مظہری کا مرثیۂ شام غریباں'' پر مشتمل ہے۔جس میں زینبؑ کے کردار کا بصیرت افروز تجزیہ ملتا ہے۔ابتدائی سَوا تین صفحات میں انھوں نے صفات زینبؑ بیان کیے ہیں اور بقیہ صفحات پر اسلامی تاریخ کی ایک عظیم الشان اور پاکیزہ سیرت خاتون جناب زینبؑ کے مثالی اور لازوال کردار کا معلومات سے پُر تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔عباس رضا نیر نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جنمے شہزادؔ معصومی کے ایک معروف مرثیہ ''معراج'' کا تذکرہ بھی اپنے ایک تنقیدی مضمون میں کیا ہے۔یہ مرثیہ ۴۷ بندوں پر مشتمل ہے اور شہزاد معصومی اسے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تخلیق کر اعلیٰ مرثیہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ مرثیہ کا عنوان شہزادؔ معصومی نے مولانا محمد علی جوہر کا مشہور زمانہ شعر ''قتل حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے'' رکھا ہے۔چونکہ معراج کا ذکر تو قرآنِ کریم میں بھی ہے اس لئے قرآن کی زبان میں بیان کی جانے والی محمد ﷺ کی اس معراج کو شہزاد معصومی نے کس طرح ملاحظہ کیا ہے اور اس عظیم واقعے کو کس طرح اپنے مرثیے کے قالب میں ڈھالا ہے جس کا اندازہ اس عالمانہ تجزیاتی مضمون سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔جس میں قرآن مجید کی آیتوں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ابھی تک میرؔ و غالبؔ کی شاعری پر سینکڑوں مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن موصوف نے اُن سے ہٹ کے بالکل ایک منفرد موضوع کو تلاش کر اس فہرست میں ایک اور قابل قدر اضافہ کر دیا ہے۔''میرؔ کی غزلوں میں علاماتِ کربلا''، ''غالب کی غزلوں میں استعاراتِ کربلا''، ''علی سردار جعفری کی نظموں میں علاماتِ کربلا'' اور ''عرفان صدیقی کی شاعری میں استعاراتِ کربلا'' جیسے مضامین اس کے گواہ ہیں۔ناقدین ادب نے میرؔ کے بارے میں یہ تو کہا کہ میر درد و الم کے شاعر ہیں اور اسی سبب انہیں قنوطی شاعر کے نام سے بھی جانا گیا۔لیکن اس کے ساتھ ناقدینِ میرؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرؔ کی قنوطیت غمِ عشق، غمِ روزگار، غمِ زندگی وغیرہ سے مستعار ہے۔لیکن شاید ہی کسی نے ابھی تک یہ لکھا ہو کہ میرؔ نے درد و غم و، درد والم، حزن و یاس سے متعلق شاعری میں برتی گئی علامات کہاں سے اخذ کیں۔اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ شکست و ریخت، رنج والم اور ہجر والم کے مضامین اور منظر نامے میرؔ نے بارہا کربلا سے مستعار لئے ہیں اور واقعۂ کربلا کے احساس و ادراک اپنے وجود اور اپنے شعور کا حصہ بنانے سے میرؔ کے یہاں یہ کیفیت شدید تر انداز میں در آئی۔مثال کے طور پر موصوف نے میرؔ کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جن میں کربلا کے واقعے سے کوئی استعارہ یا کوئی علامت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ اور اس نوعیت کے دیگر مضامین بھی معلومات سے لبالب ہیں۔''مطالعہ مراثی کی خشت اوّل: موازنۂ انیس و دبیر'' بھی ایک قابل رشک مضمون ہے۔جس میں کئی نئے پہلو روشن کیے گئے ہیں۔عباس رضا نیر نے بہت ہی بے باک انداز میں لکھا ہے کہ ''موازنۂ انیس و دبیر'' کا بنیادی موضوع انیس و دبیر کا موازنہ نہیں بلکہ میر انیسؔ کے شعری امتیازات کو واضح کرنا ہے۔انھوں نے تنقیدی رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے وجود سے شبلی نعمانی نے اردو میں تقابلی مطالعہ کی بنیاد تو رکھی لیکن دبیرؔ کے ساتھ اس کتاب میں انھوں نے بڑی ناانصافی برتی ہے۔شبلی نے میر انیسؔ کے شعری امتیازات کو نمایاں کرنے کے بعد مرزا دبیرؔ کی شاعری کو ان کے پہلو میں رکھ کر صرف موازنے کا کام لیا ہے۔

انھوں نے دبیرؔ کی خامیوں پر تو سخت تنقید کی لیکن خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اپنے منصب کا حق ادا نہ کر سکے۔ جہاں انیس و دبیر کو زندگی میں ہی اپنے شعری محاسن کی بنیاد پر بے پناہ شہرت نصیب ہوئی۔تو بعد میں صرف دبیرؔ کی خامیوں کو اجاگر کرنے کا بھلا کیا جواز؟۔یہی وجہ تو ہے کہ بعد میں کتاب کے شائع ہوتے ہی اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔عباس رضا نے اس مضمون میں شبلی نعمانی کے متوازن تقابل نہ کرنے پر جہاں اختلافات کیے وہیں ان کی زیرِنظر کتاب کو مرثیے کی تنقید اور انیس و دبیر کی تعبیر وتفہیم کی راہ میں خشتِ اوّل قرار دیا ہے۔اس کتاب میں شامل دیگر اہم مضامین ''آنسو،تلوار اور کربلا''،''پروفیسر فضل امام بحیثیت انیسؔ شناس'' اور عصمت چغتائی کے ناول پر لکھا گیا مضمون ''ایک قطرۂ خون: ایک جائزہ'' مصنف کے تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔

''رثائی تنقیدیں'' میں شامل مضامین میں مرثیۂ عناصر نمایاں کرنے کی جاندار کوشش کی گئی ہے۔ساتھ ہی ان مضامین میں مصنف کے سلیس و فصیح اسلوب،اظہار خیال کی قوت و وسعت،زبان و بیان کی ندرت،موضوعات کے تنوع اور بالغ نظر تنقید کا پہلو بھی صاف نظر آتا ہے۔

2016ء میں ہی عباس رضا نیر کی ایک اور تحقیقی و تنقیدی کتاب ''خواجہ احمد عباس'' شائع ہوئی۔جس میں انھوں نے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور فن کے متنوع پہلوؤں پر بہت ہی عمیق انداز میں لکھا ہے۔اس میں ان کا سلوبِ تحریر بہت شستہ،شگفتہ اور سلجھا ہوا ہے مزید برآں تحریروں میں اتنی روانی،سلاست،فصاحت،اور چاشنی ملتی ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف خود اپنی زبانی خواجہ صاحب کی رودادِ زندگی بیان کر رہے ہوں۔کتاب میں ایمانداری کے ساتھ فٹ نوٹس کا اہتمام بھی برتا گیا ہے۔مصنف نے خواجہ احمد عباس کی زندگی اور کارناموں سے متعلق ہر گوشے کو منور کیا ہے۔

عباس رضا نیر نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جنمے اردو کے ایک معروف اور اہم فکشن نگار،ڈراما نگار،ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے صحافی،مشہور فلم ساز،اردو زبان وادب میں ایک رنگا رنگ حیثیت رکھنے والے اعلیٰ فنکار خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور کارناموں کو مذکورہ کتاب کے ذریعے نمایاں کر ایک اہم اور مدلل کارنامہ انجام دیا ہے۔ابھی تک خواجہ صاحب پر صرف دو چار رسائل میں ہی خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ ان پر محض ایک دو کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں۔گو کہ حال تک ان پر کوئی تحقیقی وتنقیدی کاوش منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔ہوسکتا ہے کسی جامعہ میں ان پر ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی کام ہوا ہو لیکن کتاب منظر عام پر نہ آنے اور پوری معلومات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔جن رسالوں کے خواجہ احمد عباس پر خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں ان میں ایوانِ اردو(دسمبر 1987)، دریافت(1989)،اردو دنیا(جون2014)اور آجکل قابل ذکر ہیں۔کتابوں میں راج نرائن راز کی مرتبہ ''خواجہ احمد عباس: افکار،گفتار،کردار'' کے علاوہ 'خواجہ احمد عباس :ایک مطالعہ'' از ڈاکٹر غلام حسین اور ڈاکٹر ضیاء الدین نے کسی نام سے کتاب لکھی ہے،مزید کچھ افسانوی انتخاب کی کتابیں ہیں اور کچھ بکھرے ہوئے مضامین ہوں گے۔بس اتنا سا کام ابھی تک خواجہ احمد عباس کی ذات اور فکر وفن کے حوالے سے ملتا ہے اور کچھ نہیں۔آج تک اتنے بڑے قلم کار کو اردو دنیا نے فراموش کیا جس پر صرف حیرت ہوتی ہے اور افسوس کیا جا سکتا ہے۔اب عباس رضا نیر کی کتاب ''خواجہ احمد عباس'' کے شائع ہونے سے یہ خلش کسی حد تک دور ہوئی ہے۔یہاں پر یہ بات باور کرانا ضروری ہوجاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے کارنامے اتنے وسیع اور بے بہا ہیں کہ اتنی مختصر سی کتابوں سے اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔اس لیے ان پر جتنا کام ہوا ہے وہ تشفی بخش نہیں ہے۔اسے ہماری بدنصیبی سمجھئے یا

بے اعتنائی برتنے کی ایک وجہ بھی۔ یہاں پر اس بات اضافہ کردوں کہ یہ مضمون ڈیڑھ برس قبل لکھا گیا تھا۔ جبکہ گذشتہ برس پروفیسر ارتضی کریم نے خواجہ احمد عباس کا کلیات شائع کیا ہے جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس کے شائع ہونے سے خواجہ احمد عباس کے تعلق سے بہت ساری باتوں کا علم ہوگا اور ان کی تقریباً تمام تحریروں سے استفادے کا موقع ملے گا۔

خواجہ احمد عباس پر عباس رضا نیر کی اس تصنیف کردہ کتاب کے ابواب میں خواجہ صاحب کی ''حیات و شخصیت''، ''افسانہ نگاری''، ''ناول نگاری''، ''ڈرامہ نگاری''، ''صحافت نگاری''، ''خودنوشت'' اور ''سفرنامہ'' کا مکمل طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔ اولین باب میں موصوف نے خواجہ صاحب کے خاندان، آباؤ اجداد، والدین، ان کی پیدائش، تعلیم، ازدواجی زندگی، تحریری و تقریری اور صحافتی سرگرمیاں، معاصرین، میلانات، ابتداء میں ترقی پسندی نظریات کے خاص پیروکار، بعد میں ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کے علاوہ خواجہ صاحب کی ادبی زندگی، فلمی زندگی، صحافتی زندگی، مختلف زبانوں پر ان کی دسترس، انگریزی زبان میں ان کے تخلیقی سرمایے، ترجموں اور اعزازات کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور سیرت کو جن خصائص نے مثالی اور بہترین بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے ان کا بھی کتاب میں ذکر ملتا ہے۔ اردو میں خواجہ احمد عباس کے افسانوی مجموعوں کی تعداد تقریباً دس ہیں۔ جن میں ''ایک لڑکی''، ''زعفران کے پھول''، ''میں کون ہوں''، ''دیا جلے ساری رات''، ''کہتے ہیں جس کو عشق''، ''پیرس کی ایک شام''، ''گیہوں اور گلاب''، ''نیلی ساری''، ''بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنون'' اور نئی دھرتی نئے انسان'' قابل ذکر ہیں۔ اس باب میں خواجہ صاحب کے سب افسانوی مجموعوں کے اہم اہم افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں ابابیل، سردار جی، دیا جلے ساری رات، پاؤں میں پھول، لوان مسوری، ڈیڈ لیٹر، کہتے ہیں جس کو عشق، گیہوں اور گلاب، سردی گرمی، شکر اللہ کا، دو ہاتھ، سونے کی چار چوڑیاں، خزانہ، ٹیری لین کی پتلون، تین بھنگی، ہنومان جی کا ہاتھ، بنارس کا ٹھگ، خونی، نیلی ساری، واپسی کا ٹکٹ، آج کے لیلیٰ مجنوں، زعفران کے پھول، ایک لڑکی سات دیوانے، چڑیا چڑے کی کہانی، سیاہ سورج سفید سائے، نئی جنگ، چراغ تلے اندھیرا وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے جس افسانے کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، اس کا نام 'ابابیل' ہے۔ اس کہانی کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ عباس رضا نیر نے اس افسانے کا تنقیدی تجزیہ عرق ریزی سے کیا ہے اور اس افسانے کی مختلف جہتوں کی طرف ہماری توجہ مرکوز کی ہے۔ مذکورہ بالا افسانوں کے بھی دانشورانہ تنقیدی تجزیے کیے گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے عباس رضا نیر نے اس زمانے کے ماحول، ہندوستانی معاشرے، رجحانات، نظریہ سازی اور طبقاتی کشمکش وغیرہ کو زیر غور رکھا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے معاصرین کے افسانوی موضوعات کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ جو کہ ان کے بصیرت آموز تنقیدی تجزیے کی خوبی میں ایک اور اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کے فسادات پر لکھے گئے افسانوں کو ان کے معاصرین جیسے کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، منٹو وغیرہ کے مذکورہ موضوع کے ہمہ پہلو رکھ کر پرکھا ہے اور ان کی کامیاب کہانی کار کی دلیل پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے خواجہ صاحب کے عشقیہ افسانوں، نفسیاتی کہانیوں، ترقی پسند نظریہ کی نمائندگی کرتی ہوئی کہانیوں، واقعات اور حقیقت پسندی پر مبنی کہانیوں، نچلے، متوسط اور اعلیٰ طبقے کی کہانیوں پر بھی اپنی طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ عباس رضا نیر نے خواجہ احمد عباس کے موضوع، فن، تکنیک اور اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف دلیلیں

اور مثالیں دے کر ان کی فنّی، فکری اور تخلیقی اعتبار کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔عباس رضا نیر لکھتے ہیں:

''خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے مطالعے سے قاری کو ان کے یہاں غیر معمولی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔اس طرح کا تنوع ان کے معاصرین میں صرف کرشن چندر کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔کرشن چندر تجربہ پسند مزاج کے مالک تھے۔انہوں نے مغرب کے افسانوی ادب کے تجربوں کو اتنی خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔بہرحال خواجہ صاحب کے یہاں تنوع صرف موضوع کی سطح پر نہیں ہے۔بلکہ تکنیک اور اسلوب کی سطح پر بھی ہے۔''

(''خواجہ احمد عباس از عباس رضا نیر،ص ۶۵)

خواجہ احمد عباس ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ایک حساس فنکار کی سب خوبیاں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔انھوں نے سماجی مسائل،معاشرتی پسماندگی،تہذیبی اقدار اور خاص طور پر مسلم معاشرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔علامتی انداز میں لکھے گئے افسانوں میں بھی خواجہ صاحب اپنے حقیقت پسندانہ روّیے کو قایم رکھتے ہیں۔باقی مثالی کرداروں کی تخلیق اور مناظر کی تصویر کشی کرنے میں انہیں بھرپور مہارت حاصل ہے۔ان سب خصوصیات کا اندازہ خواجہ صاحب کے افسانوں پر کیے گئے عباس رضا نیر کے تجزیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

عباس رضا نیر نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس'' میں خواجہ صاحب کے ناولوں 'انقلاب'، 'بمبئی رات کی باہوں میں'، 'سات ہندوستانی'، 'چار دل چار راہیں'، 'اندھیرا اجالا'، 'دوبوند پانی' اور 'تین پیسے' کا بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے تجزیہ کیا ہے۔ناول 'انقلاب' کا تجزیہ تیس صفحات پر کیا گیا ہے۔گویا تحقیق کرنے والوں کے لئے انھوں نے راہ صاف کر دی ہے۔دیگر ناولوں کے تجزیے میں بھی ان کی تنقیدی بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔عباس رضا نیر نے خواجہ صاحب کے فنِ ڈرامہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ان ڈراموں میں زبیدہ، گاندھی اور غنڈہ، بارہ بج کر پانچ منٹ، رپورٹر، لال گلاب کی واپسی، یہ امرت ہے، انناس اور ایٹم بم وغیرہ شامل ہیں۔مصنف نے موضوع، تکنیک اور پیشکش کے اعتبار سے ناولوں کا خوبصورت تعارف کرایا ہے۔اسی طرح اس کتاب میں خواجہ صاحب کی صحافت نگاری، سفرنامہ نگاری اور فنِ خودنوشت نگاری پر عباس رضا نیر نے اپنی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔بہرحال عباس رضا نیر کی خواجہ صاحب پر لکھی گئی یہ کتاب اردو ادب اور تحقیق وتنقید کے میدان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔

بارّہ سال قبل ڈاکٹر عباس رضا نیر جلالپوری کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''ادبی میزان'' پہلے ہی قارئینِ اردو سے دادِ تحسین وصول کر چکی ہے۔اس کتاب میں جہاں کلاسیکی شعراء و مرثیہ نگاروں کے کلام کی تفہیم وتعبیر پیش کی گئی تھی وہیں اس میں معروف تخلیق کاروں کے تخلیقی فن پاروں کا بہترین تجزیہ بھی ملتا ہے۔عباس رضا نیر کی تنقیدی عناصر کے اوّلین نمونے ''ادبی میزان'' میں ملتے ہیں۔گویا کہ اسے تنقیدی میدان میں موصوف کا نقشِ اول قرار دیا جاسکتا ہے۔

بحیثیتِ مرتب وتالیف کار کے عباس رضا نیر پچھلے کچھ برسوں میں ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔حالانکہ ایک شاعر، ناقد، مترجم، مبصر اور ناظم کی حیثیت سے لوگ ان کی صلاحیت کو پہلے ہی بھانپ چکے تھے۔اچھے موضوعات پر کتابیں ترتیب دینا بھی ایک قلم کار کے فرائض منصبی میں شامل ہیں۔جس سے عباس رضا نیر بخوبی واقف ہیں۔'مجروح : کچھ یادیں کچھ باتیں'، 'کربلا فہمی'، 'خطوط بنامِ ضمیر'، 'فہرست مخطوطات: کانگریس لائبریری امریکہ'، 'احساس (ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے مضامین کا مجموعہ)' اردو ناول اور اودھ'، 'ابھی میں سفر میں

ہوں (سلیم کیفی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)' وغیرہ ان کی اردو میں مرتب کردہ کتابوں کے نام ہے۔ 'کربلا فہمی' اور 'اردو ناول اور اودھ' ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کوششوں سے منعقد کیے سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کے مجموعے ہیں جنھیں نیر صاحب نے بے حد سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ دونوں کتابوں میں ان کا دیباچہ اور مضمون شامل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مرتب کی گئی کتابیں ان کی تنقید فہمی کا دیرپا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

عباس رضا نیر عصرِ حاضر کے ناقدینِ ادب میں اہم مقام پر براجمان ہیں۔ لیکن ان کا اندازِ نقد دیگر ناقدین سے بالکل انفرادی ہے۔ موصوف ایسے گھسے پٹے اور فرسودہ موضوعات پر قلم چلانے سے انحراف کرتے ہیں۔ جن سے ادبی دامن کو کوئی کشادگی حاصل نہیں ہوتی اور جسے قارئینِ ادب کے اذہان میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صرف الجھن ہی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نیر صاحب دیانت دارانہ اور منصفانہ اندازِ نقد کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ نئی نئی چیزوں کی کھوج وتلاش اور اپنے متجسس اور اختراعی و تخلیقی ذہنیت کی آمیزش سے ان کا تنقیدی شعور بلند و بالا نظر آتا ہے۔ نیر صاحب ایک باشعور تنقیدی صلاحیت رکھنے والے فنکار ہے، جس کی بنیاد پر انہیں اعلیٰ تنقید نگاروں کی صف میں رکھنے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ ان کا تنقیدی اسلوب دیگر ناقدین سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ دوسروں کی راہ پر نہیں چلتے بلکہ اپنی راہ خود متعین کرتے ہیں۔ لیکن ہٹ دھرم بھی نہیں ہے۔ ادب کی ہر اہم روایت کے امین ہے تبھی تو ان کی تنقیدی تحریروں میں کلاسیکی وعصری شعور کی بالائی پائی جاتی ہے۔ لفظیات کے بارے میں کیا بیان کروں، جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے یہاں عمدہ نثری بیانیہ ملتا ہے۔ جس میں کہیں پیچیدگی نہیں اور نہ کہیں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ اپنی تحریروں میں حوالے اور فٹ نوٹس ان کی صاف بیانی کی دلیل ہیں۔ عباس رضا نیر اپنی کتابوں میں دوسرے ادبا سے اپنے حق میں تحریر لکھوانے یا شائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے ہیں بلکہ پورا قاری پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ قاری کتاب کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے پیش کرتا ہے۔ نیر صاحب کی ایک خوبی جو بہت پسند آئی وہ یہ کہ کتاب کے مسوّدے کو جلد بازی میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجتے یا یوں کہیں کہ عجلت پسندی کے شکار نہیں ہوئے ہیں اسی وجہ سے ان کی کتابوں میں کوئی غلطی پروف ریڈنگ کی یا کسی اور قسم کی ڈونڈھنے سے بھی نہیں ملی۔ ایک ادنیٰ سے طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے بھی نیر صاحب کی تنقیدی بصیرت کو اپنے نظریہ سے پرکھنے کی کوشش ہے، پورا حق تو ادا نہیں ہوا، اب کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ بھی قارئین پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ بہرحال ایک اچھے ناقد کی تحریروں سے بہرہ مند ہوا، جس سے بہت حد تک تسکین ہوئی۔

☆☆☆

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس' کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

یادیں

نواب میر اصغر حسین سے گفتگو

انگریزی کے ایک مشہور کہاوت ہے کہ خوب صورتی ہماری آنکھوں میں ہوتی ہے۔ مخدوم کے ساتھ خدا حافظی ہوئی تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ایک محلِ علم اور محلِ خیال سے جدا ہو رہے ہیں نا کہ ایک معمولی سے ایم ایل اے کوارٹر سے ۔ وہ تھی مخدوم کی شخصیت۔ اسی نگہ سے ہم نے پیرس کو دیکھا۔ ہمارے والد (نواب میر معظم حسین) لیبیا کے بعد یونیسکو کے ہیڈ کوارٹر سے بلائے گئے۔ لیبیا میں جو کام ہمارے والد نے تعلیم کے لیے سرانجام دیا تھا اس کی اطلاع یونیسکو کے صدر اور UNO کے صدر کو تھی۔ ہمارے والد کو عالمی سطح پر ابتدائی تعلیم کے پروگرام کا صدر بنایا گیا۔ والد کے پاس، ہمارا خاندان بھی پیرس چلا گیا۔ آج پچاس برس سے زیادہ ہو گئے ہمیں پیرس میں رہتے ہوئے ایک زمانے میں حیدرآباد، اور حیدرآباد والوں کو فرانس ایک خوابوں کی دنیا معلوم ہوتا تھا۔ فرانسیسی فرنیچر، گڑھیاں، فرانسیسی شیفال، فرانسیسی کاٹن اور کیا کیا کچھ اس پر فرانس کا لیبل لگا ہو تو لوگ ٹوٹ پڑ کر خرید لیتے تھے یہ فیشن تھا اس زمانے کے اعلیٰ طبقے میں ہمارے بزرگوں سے اس بارے میں قصے سنتے تھے وہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ فرانس نہ جا سکو تو پانڈیچیری چلے جاؤ۔ پانڈیچری سے رشتہ ہماری والدہ کے خاندان نواب امیر حسن صاحب کی اولاد سے تھا۔ امیر حسن صاحب نواب محسن الملک کے چھوٹے بھائی تھے جب امیر حسن صاحب کا انتقال ہوا جو ہمارے پرنانا تھے۔ ان کی اولاد یعنی ہماری نانی بدرالنساء بیگم صاحبہ اور ان کے سگے بھائی بہن پانڈیچری چلے گئے تھے ان بھائی بہن کی جائیداد حیدرآباد میں محبوبیہ گرلز ہائی اسکول سے لے کر چراغ علی لین تک بکھری ہوئی تھی جسے فروخت کر کے تمام تر پیسہ سری آروبندو کو دے دیا گیا تھا۔ امیر حسن صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی کو وہاں کی Mother نے پال لیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ امیر حسن صاحب کے انتقال کے صدمے سے دو چار ان کے بڑے بیٹے دارا پانڈیچری چلے گئے تھے اور سارے بھائی بہن کو بھی بلوا لیا تھا۔ چھوٹی بہن جسے صدر نے پال لیا تھا سے ملاقات صرف درشن کے موقع پر ہی ہو سکتی تھی۔ آشرم کی زندگی تھی ہی ایسی کہ نہ کسی سے ملنا ہوتا تھا نہ ملاقات ہماری والدہ شہزادی مہرالنساء بیگم صاحبہ بہت چھوٹی تھیں وہ بھی پانڈیچری جانا چاہتی تھیں لیکن ہمارے نانا نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بلوالیا۔ ان کے بعد بدرالنساء کے بھائی بہن بھی حیدرآباد واپس آ گئے۔ بدرالنساء بیگم فرنچ خوب جانتی تھیں وہاں کی صدر سے ان کی قریبی تعلقات تھے۔ ان کے تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی لوگ حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر کے لوگ بھی پانڈیچری گئے۔ ایک زمانے میں سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری بھی وہاں پہنچے تھے۔ بدرالنساء بیگم نے گوالیار کے راجپوت گھرانے کی خواتین کے لیے بھی پانڈیچری میں انتظام کیا تھا اور مدر سے ملوایا تھا۔ اس زمانے میں پانڈیچری فرنچ کے قبضے میں تھا وہاں جانے کے لیے ویزا کی ضرورت تھی۔ کسٹم ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ شیفان ساڑیوں گھڑیوں اور اونچی ایڑی کے جوتوں کا رواج بھی فرانس کے اثر سے ہوا۔ گھڑیوں پر ہیرے جڑے ہوتے تھے۔ وہاں کے پرفیوم نے حیدرآباد کے عطر کو بھلا دیا Shop King Pin پرفیوم پر تو حیدرآباد کے خاص

گھرانے جان دیتے تھے۔ بے حساب دولت لٹاتے تھے فرانسیسی ساڑیوں اونچی ایڑی کی سینڈلوں جوتوں اور پرفیوم کے فخریہ اظہار کے لیے لیڈی حیدری کلب سے زیادہ موضوع مقام کوئی اور نہ تھا۔ دوسرے ممبرس یہ سمجھتے تھے۔ شاید یہ ابھی فرانس سے آئی ہیں۔ بعض خواتین پانڈیچری جانے آنے والی خواتین سے خاص طور پر یہ چیزیں منہ مانگے دام پر منگواتی تھیں۔

جب ہم لوگ لیبیا گئے تھے تو شیر ملی Shopking Pin پرفیوم بناتی تھیں۔ ان کی بیٹی نے ایک امریکن آئیل کمپنی کے صدر سے شادی کر لی تھی وہ ہماری والدہ کی بہت قریبی دوست تھیں۔ Mr. Marinson کے بڑے گھر میں جو ٹیولی لیبیا میں سمندر کے قریب واقع تھا کے ایک کمرے میں تیراکی کے کاسٹیوم بنائے جاتے تھے۔ تیراکی کا کاسٹیوم کے سمجھئے یہ فین ڈیزائنر تھے۔ شیر ملی کے بیٹی کی ہماری والدہ سے ملاقات پیرس میں ہوئی ہم زبانی اور حیدرآبادی کلچر کی نمائندہ ہماری والدہ سے ان کی گہری دوستی ہو گئی۔ Mr. Barinson کی بیٹی Marysa Barinson ہالی وڈ کی بعد میں مشہور ایکٹریس ہوگئیں جو خاص طور پر Viscoute کی فلموں میں کام کرتی تھیں۔ مریسہ کی بہن ایک مشہور امریکن ایکٹر جنہوں نے Psycho میں کام کیا تھا سے شادی کر لی اس کا ستمبر 2001ء میں پلین کراش میں انتقال ہو گیا ہماری والدہ کو بڑا صدمہ ہوا مریسہ کو فون کرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر فون نہیں لگ سکا، مریسہ نے ایک مشہور کروڑ پتی کے ساتھ رشتہ بنانے کی کوشش کی مگر شادی نہ ہوسکی۔

ہمارے والد فرانسیسی تاریخ اور ادب کے مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔ خاص طور پر نپولین سے بڑی گہری دلچسپی تھی حیدرآباد میں اپنے کتب خانے میں اپنے سامنے نپولین کا قد آدم مجسمہ لگا رکھا تھا۔ بچپن سے نپولین پر لکھی ہوئی کتابیں جو بھی حیدرآباد میں مل سکتی تھیں خرید لیتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں 300 سے زیادہ کتابیں تو نپولین پر ہی تھیں۔ اس کے حالات زندگی تاریخی، سیاسی اور جنگی حالات قصوں سے خوب واقف تھے ان کی گفتگو سے بعض وقت ہمیں یہ تاثر ملتا تھا جیسے وہ نپولین سے ملے ہوں، جب وہ فرانس میں تھے تو فرنچ مورخ ان کی فرانسیسی تاریخ دانی سے ان کے گرویدہ ہو گئے تھے پوچھتے تھے کہ کیا ہندوستان کے لوگ نپولین کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ کہتے حیدرآباد اور ہندوستان میں انگریزی سے پہلے فرانسیسیوں کا اثر تھا ان کی تہذیب ہماری عمارتوں لباسوں اور فرنیچر وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے ''چومحلّہ'' فلک نما پیالس، پائیگاہ پیالس اور گیان باغ میں فرانسیسی اثرات آج بھی موجود ہیں۔ راجہ دھن راج گیر جی نے تو کبھی فرانس کا سفر نہیں کیا لیکن ان کے گیان باغ کی تعمیر وہاں کے فرنیچر آرائیشی اشیا کے علاوہ بہت کچھ فرانس ہی کا ہے۔ ہماری والدہ کے بہنوئی یعنی ہمارے خالو صاحب نواب زین العابدین خاں کی دیوڑھی ملک پیٹ میں فرانس ہی کا فرنیچر ٹیپو سلطان کے زمانے کا تھا ایک ایک کرسی جو لکڑی اور بید کی بنت کی تھی ایسی تھی کہ ایک انگلی سے اٹھا لی جا سکتی تھی۔ یہ فرنیچر فرانس کے بادشاہ ہندوستان کے امیروں کو تحفتاً بھیجا کرتے تھے۔ ہمارے والد ہر ہفتہ اور اتوار پیرس کے مختلف راستوں پر لے جا کر ہمیں وہاں کی تاریخ بتاتے تھے یہ بھی سناتے تھے کہ فلاں مشہور شخص یہاں رہتا تھا۔ والد صاحب کو سفر کے کئی مواقع ملے انہیں سفر پسند بھی تھا۔

ہمارے والد کے پروگراموں میں افغانستان بھی شامل تھا۔ افغانستان انہیں اتنا پسند آیا کہ وہ دو سال پیرس چھوڑ کر افغانستان ہی میں گزارے وہاں بھی کئی عجیب سے واقعات درپیش آئے آج بھی وہ یاد آتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ خواب تھا یا کوئی

فلمی ریل یا کوئی چیتکار۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ Indian Ambassador اپنی گاڑی میں اور ان کا خاندان ایمبسی کی گاڑی میں شکار پر نکلے ۔ایمبسیڈر کا لڑکا اپنی نئی بندوق ساتھ لے کر چلا تھا۔ یہ بندوق ان کے والد نے اسے تحفتاً دی تھی۔ ہمارے والد کے پاس ان کی 16 بور بندوق تھی جو ہالینڈ کی تھی۔ یہ بندوق ان کے چچا نواب سالار جنگ بہادر نے انہیں کسی موقع پر تحفہ میں دی تھی چلتے چلتے ایک مقام پر گاڑیوں کا قافلہ رکا۔ایمبسڈر کا لڑکا اپنی مرسیڈیز سے نیچے اترا اور اپنی بندوق پیچھے کی سیٹ پر رکھ چھوڑی۔کھانے کے بعد سب واپس ہوئے تو ایمبیسڈر نے اپنے ڈرائیور اور پھرلڑکے سے پوچھا وہ تمہاری نئی بندوق کہاں ہے؟ بیٹے نے جواب دیا پیچھے کی سیٹ پر ہے۔ بچے نے دیکھا تو بندوق غائب تھی سبھی پریشان ہوئے۔ تلاش بسیار کے بعد ایمبسڈر کی CID اور دوسرے اسٹاف نے وہاں کے گورنر کو اطلاع دی۔ پولیس اور CID سرگرم ہوگئی بازار کا گھیراؤ ہو گیا۔ ہر طرح کی چیکنگ ہوگئی کسی پٹھان کے پاس نہ کسی جگہ سے وہ بندوق برآمد ہوئی چند ہفتے بعد پتہ چلا کہ وہ بندوق نارتھ ویسٹ فرنیٹر یا شاید پاکستان چلی گئی۔ یہ قصہ اس زمانے کے قصوں سے بالکل ملتا ہے جو انیسویں صدی میں انگریزی پٹھانوں اور افغانوں کے تعلق سے لکھتے تھے۔افغانوں کے قصے ایسے ہیں جسے فارسی میں ''خواب دیدنی'' کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے نانا ایک دفعہ پیرس سے افغانستان آئے۔ان کا عین مقصد یہی تھا کہ اپنے بادشاہ بابر کی مزار پر فاتحہ پڑھیں اور زیارت کریں وہاں کے لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ بڑے احترام اور عزت سے ہمارے نانا سے ملتے رہے جیسے ایک بادشاہ اپنے گھر واپس آیا ہو۔ بابر کی ان کے یہاں بڑی عظمت جو تھی۔ نانا بابر کی مزار پر گئے زیارت کی فاتحہ کے بعد دعا کی۔ جانے کیا دعا کی پھر انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے صدر خاندان امیر تیمور کی مزار پر بھی جائیں گے۔ کابل سے نکلے ازبکستان کی طرف چل پڑے راستے میں جو پہاڑ ملتے ہیں وہ دو ہزار فٹ سے بھی اونچے ہیں۔ ایک غار بھی راستے میں ملتا ہے غار کے اندر ایک سرنگ بنی ہوئی جسے ''سالنگ پاس'' کہا جاتا ہے یہ ''سالنگ پاس'' خیبر پاس'' سے بھی اونچی ہے۔ کابل کے ڈاکٹروں نے نانا (آغا حیدر حسن صاحب) کو منع کیا کہ اتنے اونچے مقام پر آپ کو نہیں جانا چاہیے۔ نانا کو سانس کی تکلیف تھی آکسیجن سلنڈر کابل میں استعمال کرتے تھے نانا نے جواب دیا میں بہت جلدی میں ہوں مجھے ہندوستان واپس جانا ہے اور میں اسی وقت واپس ہوسکتا ہوں جب تک اپنے خاندانی امیر انسل کی مزار پر فاتحہ نہ پڑھ لوں اس جذبے اور ضد کے ساتھ ہمارے والد کے ساتھ چل پڑے افغانستان کے شمالی شہر قندوس پہنچے۔ قندوس کے گھوڑے بہت مشہور ہیں وہاں کے گھوڑ سوار شہہ سوار ہوتے ہیں ان کے یہاں ایک عجیب وغریب اور خطر ناک کھیل ہوتا ہے جو بزکشی، کہلاتا ہے وہاں کے امراء اور عمائدین کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے زبردست نسل کے گھوڑے بڑے شوق سے پالتے ہیں انہیں کھانے پر ترکاری کا ایک قسم کا پلاؤ، چلاؤ روٹی چلغوزے بادام وغیرہ کھلا کھلا کر پالتے ہیں ہمارے نانا اور ہماری والدہ کو چلغوزے بہت پسند تھے انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ یہاں گھوڑے چلغوزے اور بادام کھا رہے ہیں جو ہندوستان میں کم ملتے ہیں۔

قندوس کے گورنر نے ہمارے نانا کی بڑی آو بھگت کی خاص طور پر ان کے لیے بزکشی کا کھیل کرایا۔اس کھیل میں جو دو ٹیمیں ہوتی ہیں ان کے گھوڑا انتہائی تیار اور اس کھیل کے لیے ٹرینڈ

ہوتے ہیں گھوڑ سوار بھی اپنے فن کے ماہرین میں سے منتخب کیے جاتے ہیں۔اس کھیل میں بڑے سے میدان کے بیچوں بیچ ایک مرا ہوا دنبہ رکھا جاتا ہے ریفری کے اشارے کے ساتھ دونوں ٹیمیں آگے بڑھتی ہیں ہر ٹیم کی یہ کوشش ہوتی کہ اپنی لکڑی (جو خاص قسم کی ہوتی ہے) دنبے کو اٹھالیں اور جیت جائیں دوسری ٹیم کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے اس کوشش میں مخالف نیم کے گھوڑے کو بھی مارتے ہیں اور سوار کو بھی۔ تماشا دیکھنے والے حیرانی سے تماشا دیکھتے اور سمجھتے کہ اب کوئی بھی اس کھیل سے زندہ نہ نکلے گا۔ جو ٹیم جیت جاتی بز کو اپنے قبضے میں کر لیتی اس ٹیم کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔اس کھیل کے لیے جو گھوڑے خریدے جاتے وہ بیش بہا قیمت کے ہوتے پھر ان کی ٹریننگ پر لاکھوں روپئے خرچ کیے جاتے ہیں اس کھیل میں زندگی داو پر لگی رہتی ہے ان ٹیموں اور ان کھلاڑیوں کی وہاں کے سماج میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔

وہاں کے گورنر نے ہمارے نانا کو وہاں کا خاص جبّہ، لکڑی کے کھڑاؤں اور ٹوپیاں تحفے میں دیئے تھے۔ بہر حال نانا نے امیر تیمور کی مزار پر پہنچے کی بھر پور کوشش کی ازبکستان سمرقند تک گئے مگر امیر تیمور کی مزار تک نہ جا سکے میں نے ان سے وعدہ کیا کہ خوش نصیبی سے آ کر میں افغانستان جا سکا تو آپ کی طرف سے امیر تیمور کی مزار پر ضرور فاتحہ گزراؤں گا۔اور یہ ہمیں موقع نصیب ہوا۔کوئی بیس سال بعد ہمارا وہاں جانا ہوا۔ وہاں کے پریسیڈنٹ کے اڈوائیزر نے ہمارے ساتھ چل کر خود امیر تیمور کی مزار کھلوائی اور ہم وہاں فاتحہ پڑھ سکے۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200روپے

-/800طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

سعیدہ بانو احمد

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر

طلسم خانہ ہستی کو توڑ کر بھاگوں مگر قدموں میں جنبش نہ ہوئی۔ میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ مجھے غصہ نہیں آرہا تھا صرف یہ احساس دماغ کو مفلوج کیے دے رہا تھا کہ ایسی کھوکھلی بنیاد پر زندگی کی عمارت کیسے بنائی جاسکتی ہے۔ کھانے کا وقت آیا۔ ابن نہیں اٹھے میں نے معمول میں فرق آنا سیکھا نہیں تھا۔ میرے لیے یہ فریضہ تھا کہ وقت کی ضرورت کو پوری کرتی رہو۔ نوکروں کو کھانا وغیرہ دے کر خود پھر ڈرائنگ روم میں آبیٹھی۔ کروں کیا؟ میکے چلی جاؤں؟ وہاں کیا بتاؤں گی کہ کیا ہوا؟ عام طور سے تو عورت ہی کا قصور ہوتا ہے، اس انگشت نمائی کو میرے ماں باپ کیسے برداشت کریں گے؟ میں شوخ وشریر ضرور تھی لیکن بری لڑکی نہیں تھی مجھ میں اس قدر خود اعتمادی تھی کہ اس کلنک کے ٹیکے کو لے کر سینہ سپر ہوسکتی۔ میری شادی کو مشکل سے تین چار مہینے ہوئے تھے۔ میرے ساس سسر مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ میرے سسر جن کی ایک الگ زندگی تھی جو اپنے بیٹوں تک سے براہ راست بات نہیں کرتے تھے، خاندان کے کسی فرد کی جرأت نہیں تھی کہ ان کے کمرے میں قدم رکھ سکے۔ مجھے وہ اپنے کمرے میں بلاتے۔ زندگی کے مختلف مسئلوں پر بات چیت کرتے، بڑی محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ کورٹ سے گھر آتے ہوئے لکھنو کے کشمیر فروٹ مارکٹ سے پھل خرید کر لاتے، میں برآمدے میں بیٹھی ہوتی تو پیچھے سے میری آنکھ بند کر لیتے اور سامنے پھلوں کی ٹوکریاں رکھ دی جاتیں میں گھبرا کر کہتی ''ابا جان'' وہ اپنے ہاتھ ہٹا کر کہتے کہ دیکھو میں تمہارے لیے پھل لایا ہوں۔ اب ناشتہ منگواو میرے لیے۔ سارے خاندان میں میری دھاک بندھ گئی تھی کہ جج صاحب اپنی سنجھلی دولہن کی بہت قدر کرتے ہیں اور آج میں ان کے لیے جگ ہنسائی کا سبب بن جاؤں؟ یا خدا یہ بیڑیاں میں کیسے توڑوں۔ ان ہی خیالات میں غلطاں میں اٹھتی تھی، بیٹھتی تھی برآمدے میں کھڑی ہو جاتی پھر کرسی پر سر پکڑ کے بیٹھ جاتی۔ منہ لپیٹ کے لیٹنا مجھے آتا نہیں تھا۔ کوی چار بجے تھے سہ پہر کے کہ یہ اٹھ کر آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئے۔ لپٹ گئے مجھ سے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب انہوں نے زیادہ اختلاط برتنے کی کوشش کی تو میں نے سنبھل کر کہا کہ آپ مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہیں تو اتنا تو کیجئے کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھئے۔

''یہ آپ نے کیسے سوچا کہ میں آپ کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ غصے میں کچھ کا کچھ منہ سے نکل گیا۔ میں جاگ گیا تھا۔ بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' اب ان کا لہجہ نرم اور خوشامدانہ تھا۔

''غصے میں آپ حواس کھو بیٹھتے ہیں''۔ یہ سن کر ابن اپنا سر پکڑ کر رونے لگے۔ ''مجھے معاف کر دو سعیدہ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ غصہ میں مجھے معلوم نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ میں بہت برا ہوں۔ اب آپ ہی سمجھ داری سے کام لیں اور مجھے معاف کر دیں۔'' ابن یہ سب کہتے رہے اور روتے رہے۔ میں نے مرد کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ میرا سارا غم وغصہ ایک سکتے میں بدل گیا۔ یہ رو رو کر اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے اور میں نے بے بس ہو کر ان کی اس یقین دہانی میں پناہ ڈھونڈی۔ ہم پھر ڈگر پر چلنے لگے۔

ہم لوگ مسوری میں بارہ پندرہ دن اور رہے یکم جولائی کو ابن کی کچہری کھل رہی تھی۔ ان کو لکھنو واپس پہنچنا تھا۔ یہ طے پایا کہ میں اپنے والدین کے پاس دہرہ دون میں رہوں کچھ دنوں۔

چنانچہ ۲/جولائی کو میں دہرہ دون آگئی یہاں پریتم روڈ پر میرے والد نے ایک کوٹھی خریدی تھی۔ دہرہ دون میں مشکل سے دو دن گزر رہے ہوں گے کہ ایک صبح جو میں اٹھی تو طبیعت بے حد خراب تھی۔ شدت سے سر چکرا رہا تھا اور متلی ہو رہی تھی۔ اماں سے

کہاانہوں نے چورن دے دیا۔ جب اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اماں نے میری بیماری کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور کچھ گول باتیں کر کے کسی کام میں لگ گئیں۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی خالی بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھیں۔

دوسرے دن اور طبیعت خراب ہوئی تو ڈاکٹر بلائے گئے انہوں نے بھی مرض کی کوئی تشخیص نہیں کی یہ کہہ کر چلے گئے کہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ شام ہوتے ہوتے میری طبیعت بہتر بھی ہو گئی۔ لیکن صبح اٹھی تو پھر وہی حالت چکر شدید اور ناشتہ کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کھانے سے نفرت! اب روز کا یہی معمول ہو گیا، کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا، کمزوری محسوس ہونے لگی۔ اب بتدریج مجھے بتایا گیا کہ میرے بچہ ہونے والا ہے۔ یا خدا میں ذہنی طور سے اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ بچے کی پیدائش اپنی جگہ ایک معجزہ ہے جس کے لیے عورت کو سکون اور قبولیت کے موڈ میں ہونا چاہیے۔ مجھ میں ایسی نفسیاتی خامیاں تھیں جن کو میں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ میں ہر معاملے میں خلوص اور ایمانداری کو اپنائے رکھتی تھی۔ چنانچہ میرے شوہر کے ساتھ میرا روزمرہ کا برتاؤ نہایت توجہ اور خلوص کا ہوتا تھا لیکن وہ اس درجہ ناپختہ کار تھے کہ ان کے لیے میرا صرف مخلص ہونا کافی نہیں تھا۔ وہ اپنے ڈھنگ سے مجھ سے شدید محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی ویسی ہی والہانہ محبت کروں، شادی کے بعد محبت کی بنیاد رکھی جاتی ہے جنسی ناطے کی طمانیت پر اور مرد کی خودی کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر۔ میں ان دونوں باتوں پر پوری نہیں اُتر سکی۔ ان کا گھڑی گھڑی روٹھ جانا کچھ تو اس وجہ سے تھا اور کچھ ان کی عادت بھی تھی۔ بہر حال میری سمجھ میں یہ ساری صورت حال آئی ہی نہیں۔

آخر جولائی میں دو دن کی چھٹی لے کر ابن دہرہ دون آئے۔ میری طبیعت خراب تو رہتی ہی تھی، کھانا پینا چھوٹ جانے کی وجہ سے کمزوری بھی ستا رہی تھی۔ رات کو یہ مجھ سے بہت محبت اور دل داری سے پیش آئے۔ دنیا بھر کی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنی طرف سے ان کی خوشنودی میں کمی نہیں ہونے دی۔ پھر نہ جانے کیا بات ہوئی جس پر میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بالکل یاد نہیں کہ کیا بات تھی مگر تھی کوئی چھوٹی سی بات۔ ابن اس پر بے حد خفا ہو گئے اور غصے کا پارہ اتنا چڑھا کہ میرے منہ سے نکل گیا کہ ''میری چھوٹی سے چھوٹی بات تو آپ کو ناگوار گزرتی ہے۔ آپ کو لکھنو سے آنے ہی کی کیا ضرورت تھی''۔

یہ کہنا تھا کہ ابن بستر سے اٹھ کر چپل پہنتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ہم لوگ برآمدے میں سو رہے تھے۔ کچھ دیر تو میں سناٹے میں بیٹھی رہی۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا یہ نہیں آئے۔ میں نے اٹھ کر کمپونڈ میں دیکھا۔ وہاں یہ نہیں تھے۔ میں پھاٹک کھول کر کمپونڈ سے باہر آئی۔ چاندنی رات تھی۔ سناٹے کا عالم تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اپنی طویل سڑک پار کر کے برابر کی دوسری سڑک پر مڑی تو دیکھا کہ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کوئی کھڑا ہے۔ نزدیک گئی تو ابن تھے۔ غم و غصے سے میرا برا حال تھا۔ لڑتی جھگڑتی منتیں کرتی اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہوئی میں انہیں گھر لائی۔ اب کوئی رات کے دو بجے کا عمل تھا کاش میں اس رات کو رو رو کر اپنا برا حال کرتی ابن خود سے گھر لوٹ آتے۔ ماں باپ کو سارا حال معلوم ہوتا۔ ابن اپنے طریقے سے اپنے کیے کو سنبھالتے۔ اور میں اتنی نڈر نہ ہوتی کہ دو بجے رات کو ان کو ڈھونڈنے نکل جاتی۔

یہ تھا وہ بنیادی فرق جو ہم لوگوں کے درمیان تھا اور جسے محض رسم و رسوم کے سہارے مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ گھر آ کر ہم دونوں خاموشی سے اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹ گئے۔ اور پھر سو بھی گئے ہوں گے۔

دو تین دن کے بعد یہ واپس لکھنو چلے گئے اور میں یہ سوچتی رہی کہ کیا کروں۔ شوہر کے ساتھ میں نے کبھی کوئی بدزبانی نہیں کی۔ گھر کے سارے افراد سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ گھر کے انتظام میں پھوہڑ نہیں ہوں۔ ان کے آرام و آسائش کا انتہائی خیال رکھتی ہوں۔ کہیں تفریح نہیں کرتی پھرتی، یہ جب

کچہری سے آتے ہیں ہمیشہ گھر میں موجود ہوتی ہوں۔ جہاں جاتی ہوں ان کے ساتھ ہی آتی جاتی ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عام بیویوں سے کچھ زیادہ ہی ان کے درجے کا رکھ رکھاؤ کرتی ہوں پھر کیا خطا مجھ سے سرزد ہوتی ہے کہ یہ اس درجہ بیگانہ ہوجاتے ہیں کہ رات کو بارہ ایک بجے مجھ سے روٹھ کر گھر چھوڑ کے چل دیئے۔ انہیں معلوم تھا کہ میری طبیعت اچھی نہیں۔ پیٹ میں ان کے دیئے ہوئے بچے کی نشوونما ہورہی ہے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں کہ ان کے برتاؤ کی میں نے ابھی تک کسی سے شکایت نہیں کی ہے۔ اس وقت یہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہے۔ میں ایسی بے جا حرکت یہاں تو نہ کروں۔ معلوم نہیں انہیں کیا ہوجاتا تھا اور میری سمجھ میں کیوں نہیں آتا تھا کہ میں کیا رویہ اختیار کروں۔

لکھنو سے ان کا نہایت محبت بھرا خط آیا۔ لکھا تھا کہ ''میرا تبادلہ گورکھپور کا ہوگیا۔ میری طبیعت بدستور خراب رہی بلکہ گرتی چلی گئی۔ اب نقاہت سے چلنا پھرنا دوبھر ہورہا تھا۔ ستمبر کے آخر میں بمشکل لکھنو واپس لائی گئی میری ساس اور نندسب اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور سب کا اصرار کہ میں سیدھی ریڈیچی روڈ چلوں۔ میرے والدین راضی ہو گئے او رمیں سیدھی اپنی سسرال پہنچی۔ یہاں سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سب کی یہ کوشش تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچایا جائے۔ حالت میری وہی تھی۔ کھانے کی کسی چیز سے رغبت نہیں تھی۔ انواع واقسام کے کھانے پکوا کر میز پر لگائے جاتے اور میں ایک ایک نوالہ بھی مشکل سے کھاسکتی۔ یہاں تک کہ پانی بھی ہضم نہیں ہوتا تھا۔

ابا جان حسب دستور کچہری سے آتے ہوئے طرح طرح کے پھل اپنے ساتھ لاتے۔ میرے سامنے یہ پھل لگائے جاتے۔ او رمیں کھانہ پاتی۔ ہوتے ہوتے بالکل پلنگ سے لگ گئی۔ لیٹے لیٹے نہلایا جاتا۔ سر دھلایا جاتا ایک نرس رکھ لی گئی میری خدمت کو۔ غرض کہ میں نے ایسا ڈھونگ رچایا کہ باید وشاید۔ ڈاکٹر بلائے جاتے وہ بھی تسلی کے لیے کوئی دوا تجویز کر کے چلے جاتے۔ سارا گھر پریشان تھا۔ والدین فکروتشویش سے گھلے جارہے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں تو میں اپنی اس کیفیت کو ڈھونگ سے تعبیر کرتی ہوں۔ اس زمانے میں تمام نفسیاتی الجھنوں کو ریت رسم کے دباؤ سے سلجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لاشعوری طور پر میری کیفیت کے ذمہ دار ہمارے آپسی تعلقات کی بدمزگی اور وہ دھکا تھا جو میری خودی کو ان کی بے خیالی سے پہنچتا رہتا تھا۔ نومبر کے شروع میں میری والدہ مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ وہاں بھی کم و بیش میری طبیعت ڈانو اڈول ہی رہی۔ لیکن دسمبر کے شروع سے میری طبیعت میں بہتری ہونا شروع ہوئی۔ غذا کی طرف کچھ رغبت بڑھی اور آہستہ آہستہ میں معمول کے مطابق کھانا کھانے لگی۔ کم زوری کم ہوتی گئی۔ اس زمانے میں مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ ماں دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے۔ میری والدہ بہت کم سخن بی بی تھیں مگر خاندان میں سب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس طرح کہ جس کا کوئی ذکر اذکار نہیں تھا۔ گویا گھر میں سب ہی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھا ہی جاتا ہے۔ اس زمانے میں میرے والدین کلانڈا روڈ پر ایک کرایے کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ۳۱؍دسمبر کو ہم لوگ رات کا کھانا ختم کر کے ادھر ادھر کی باتیں کررہے تھے۔ میرے بھائی نیا سال منانے Valerio (لکھنو کا ایک مخصوص Restaurant) جاچکے تھے۔ میاں کا معمول تھا کہ اس وقت فراغت سے بیٹھ کر ہم سب سے تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ میاں نے یکا یک اپنا سر میز پر ٹکا دیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ان کا سر تھاما تو وہ پسینے سے شرابور تھے۔ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شدید درد ہے۔ میں نے اور اماں نے بمشکل میاں کو ان کے پلنگ پر لٹایا۔ اماں کو ڈھارس دی کہ آپ میاں کو سنبھالیے۔ نوکر کو تاکید کی کہ بیگم صاحبہ کے پاس سے ہٹنا نہیں اور میں ایک کوٹ کندھے پر ڈالتی ہوئی کارلٹن ہوٹل کی طرف چل پڑی۔ جو گھر سے کوئی سات آٹھ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے میں نے سیول سرجن کو ٹیلی فون کیا کہ وہ فوراً میرے گھر پہنچ

جائیں Valerio کے منیجر کو ٹیلی فون سے کہا کہ مہدی میاں میرے بھائی سے کہیں کہ وہ فوراً واپس گھر آ جائیں۔ اپنی بہن کو اطلاع کی کہ میاں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ لکھنو چھوٹی جگہ ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سیول سرجن ہمیشہ انگریز ہوتا تھا۔

سب کو خبر کر کے میں تیزی سے گھر واپس آ رہی تھی کہ راستے میں مجھن بھائی نے موٹر روک کر مجھے بیٹھنے کو کہا۔ غرض کہ کوئی بیس منٹ کے اندر میں اور میرے بھائی گھر پہنچ گئے اور ساتھ ہی سیول سرجن کی گاڑی میرے گھر کے آگے رُکی۔ میاں سخت بے چین تھے۔ ڈاکٹر نے فوراً Morphia کا انجکشن دیا۔ انجکشن سے مریض کو قدرے سکون ہونے لگا۔ یہاں تک کہ غنودگی طاری ہو گی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا ہے اگر انجکشن سے سکون قایم رہا تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ نیز یہ کہ مریض نہ باتیں کرے نہ ہلے جلے مکمل آرام کی ضروت ہے۔ اتنے میں میری بہن بھی آ گئیں۔ میاں نے رات آرام سے گزاری۔ صبح نقاہت بہت تھی۔ ہم سب نے ڈاکٹر کے احکامات پر عمل کیا اور چار دن کے بعد میاں کی کمزوری کچھ کم ہوئی۔ انہوں نے تفصیل پوچھی۔ تو انہیں سارا حال بتایا گیا۔ شام کو ابن بھی میاں کو دیکھنے آئے تو میاں نے ان سے کہا کہ۔ ''زوجہ شما کارے کرد''

آج بھی ان کا یہ جملہ کانوں میں گونجتا ہے اور نہ جانے کس کس طرح مجھ کو سہارا دیتا ہے۔

جنوری کی ۱۴ر تاریخ تھی۔ میں میکے ہی میں تھی۔ دن کے تین بجے تھے کہ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے درجنوں سڑک کوٹنے کے انجن گھڑ گھڑاتے ہوئے گھر میں چلے آ رہے ہیں۔ اماں ایک پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی سامنے ایک کپڑا رکھے اسے قطع کر رہی تھیں۔

''ارے گری گری گری۔'' اماں چیخیں

سامنے دیکھا تو یوکلپٹس کے چھتنا ور درخت زمین بوس ہو رہے تھے۔ میں نے اماں کو پلنگ کے درمیان میں ڈھکیل دیا۔ پھر یکا یک میری سمجھ میں آیا کہ یہ زلزلہ ہے۔ میں اماں کو پلنگ پر سے کھینچ کر باہر کمپونڈ میں لے آئی۔ میاں اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔ سارے نوکر بھی جمع ہو گے۔ کمپونڈ کے اونچے اونچے درخت سڑک کے اس پار کی عمارتیں اور خود ہمارا گھر ایسے جھوم رہے تھے جیسے بھنور میں کشتی۔ یہ زلزلہ کوئی ساڑھے تین منٹ کا تھا۔ ایسے ہولناک تجربے کے لیے ساڑھے تین منٹ بہت ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء، ۱۴ر جنوری کا یہی زلزلہ کوئٹہ میں دس منٹ رہا۔ اور بہار میں بھی اس نے بڑی قیامت ڈھائی۔ ہمارے پیروں کے نیچے زمین ہل رہی تھی اور ہم لوگ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری کائنات اب کسی لمحے میں ڈھے جائے گی۔ زلزلہ ختم ہوا تو کئی منٹ تک ہم سب بالکل بھونچکے سے کھڑے رہے۔ جب بولنا شروع ہوا تو ہر شخص اپنی اپنی واردات سنا رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پرانی عمارتوں کو زیادہ نقصان ہوا ہے۔ بہت سے پرانے پیڑ گر گئے ہیں مگر مجموعی طور پر شہر کو بہت نقصان نہیں ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو میرے سسر جسٹس محمد رضا ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے ہی انہوں نے ریڈیجی روڈ کے بہت بڑے بنگلے کو چھوڑ کر ایک دوسری کوٹھی شاہ نجف روڈ پر کرایہ پر لے لی تھی اور مجھے حکم ملا تھا ابا جان کی طرف سے کہ وہاں ایک الگ ڈرائنگ روم ،آسمانی رنگ کے پردوں اور ان سے میچ کرتے ہوئے فرنیچر سے سجایا جائے۔ یہ خاص ابا جان کا گول کمرہ ہوگا۔ شروع جنوری میں سسرا خاندان شاہ نجف روڈ کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا اور آخری جنوری تک میں نے ابا جان کا آسمانی ڈرائنگ روم سجا دیا۔

میری صحت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں ریڈیجی روڈ آ گئی۔

ڈاکٹروں کی تجویز تھی کہ میں ٹہلنے جایا کروں۔ چنانچہ حکم یہ ہوا کہ سرکار کی گاڑی میں بندھے تک جاوں اور پھر وہاں اتر کر ٹہلوں۔ اب ہر روز قدرے اندھیرا ہونے پر میں ابا جان کی Seven seater فیٹ پر بندھے کی سڑک پر ٹہلنے جاتی تھی۔ یہاں چند سیڑھیاں اتر کر ہموار سڑک ملتی تھی۔

کوئی ۳۰؍جنوری کو ابا جان نے مجھے بلوا بھیجا میں حاضر ہوئی۔ وہ مجسم شفقت تھے۔ کہنے لگے کہ دیکھو کل مجھے وائسرائے کا یہ خط ملا تھا میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پڑھ کر اپنی چچی جان کو بتاؤ کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے پڑھا پھر اپنی ساس کو ترجمہ کر کے بتایا کہ وائسرائے نے اپنی Legislative Council کی ممبری کی پیشکش کی ہے ابا جان کو۔ آپسی مشورے کے بعد ابا جان نے اس اعزاز کو قبول کرنے کا جوابی خط وائسرائے کو روانہ کر دیا۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ وہ یکم مارچ ۱۹۳۴ء سے ان فرائض کی ادائیگی کے لیے دلی حاضر ہو جائیں گے۔

ابا جان کو Prostate کا مرض تھا جس کا علاج صرف آپریشن تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ ۲؍فروری کو لکھنو کے مشہور سرجن ڈاکٹر بھاٹیا ابا جان کا آپریشن کریں گے۔ ڈاکٹر بھاٹیا ہمارے پڑوسی بھی تھے اور ابا جان کے بہت قریبی دوست بھی، گھر کا ایک کمرہ پوری طرح Disinfect کیا گیا دو پرائیویٹ نرسوں کا انتظام کیا گیا اور نیز یہ کہ آپریشن کے بعد ڈاکٹر بھاٹیا کے بڑے لڑکے راج بھاٹیا دن رات ہمارے ہی یہاں رہیں گے تاکہ کسی قسم بد احتیاطی یا لا پروائی نہ ہو سکے اور نرسوں کی تیمارداری کی مکمل نگرانی کی جا سکے۔

آپریشن ہو گیا۔ پوری احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کامیاب بھی قرار دیا گیا۔ نرسیں مستعدی سے تیمارداری کے فرائض انجام دیتی نظر آئیں اور ڈاکٹر راج بھاٹیا کی موجودگی سے سب ہی کو بہت اطمینان تھا۔

آپریشن کے چودھویں دن ابا جان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ منٹوں میں معلوم ہو گیا کہ انہیں Tetanus ہو گیا ہے۔ یہ بیماری گندگی اور زنگ آلود انجکشن کی سوئی وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہاں تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی تھی کہ کسی طرح کی کوئی بد احتیاطی ہونے ہی نہ پائے۔ پھر یہ کیا ہو گیا کہ ابا جان کو ایسا مرض لاحق ہوا کہ جس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ ۱۵؍فروری ۱۹۳۴ء کو ابا جان کا انتقال ہو گیا۔ میں آخر دم تک ان کے پاس موجود تھی۔ اس سے پہلے میں نے کسی کو دنیا سے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ چچی بے ہوش ہو گئیں۔ میں حیران کہ کیا کروں۔ عزیزوں رشتہ داروں سے بھرے گھر میں کہرام مچ گیا۔ آل رضا بھائی اور مسعود رضا نے آگے بڑھ کر اماں کو سنبھالا۔ عقیلہ اور مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے اب مجھے یاد نہیں کہ ہم سب نے اپنی اپنی جگہ پر اس عظیم سانحہ کو کیسے برداشت کیا۔ عقیلہ اور چچی کی حالت غیر تھی۔ بیٹی کا چاہنے والا باپ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا۔ چچی کا سہاگ لٹ گیا تھا۔ خاندان کا ایک بھاری ستون گر گیا تھا۔ منٹوں میں سارے شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر پہنچ گئی کہ رضا صاحب جج کا انتقال ہو گیا۔ جسٹس رضا بڑے ہر دل عزیز انسان تھے۔ ان کے بے لاگ فیصلوں اور انسان دوستی کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں۔ کورٹ میں وہ جس طرح اپنے فیصلے کھرے اور منصفانہ انداز سے سناتے تھے، اس کی لوگ نقلیں کرتے تھے۔ سنا ہے کہ جنازے کے ساتھ دو ہزار کا مجمع تھا اور لوگ کاندھا دینے کے لیے بے چین تھے۔

آل رضا بھائی نے باپ کی موت سے متاثر ہو کر کچھ اشعار کہے۔ دو مجھے یاد ہیں۔

بیٹھے تھے گھنی چھاؤں میں کیا اس کی خبر تھی
بڑھ جائے گی دھوپ اور یہ سایہ نہ رہے گا
ویران گھر کو دیکھا رو کر سلام بھیجا
اجڑے ہوئے مکاں سے بچھڑے ہوئے مکیں پر

وقت تھمتا نہیں ہے۔ اب شاہ نجف روڈ کا گھر بھی بہت بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ تلاش کے بعد لاٹوش روڈ پر چندہ پور ہاؤس ملا کہ یہ خاندان کی ضرورتیں بھی پوری کرتا تھا اور بہت مہنگا بھی نہیں تھا۔

ہم سب لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔ وائسرائے کا خط طاق نسیاں ہو گیا۔

☆☆☆

شاعری

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

قطرے پیدا شعور اتنا کر لیں
بہم ہو جائیں تو دریا کر لیں

زخم پر رکھّیں کسی کے مرہم
غم میں کچھ اپنے افاقہ کر لیں

جو خوشی ہم میسر ہے منائیں
باقی تکلیف گوارا کر لیں

پیش خیمہ کسی طوفان کا ہے
لوگ کشتی سے کنارہ کرلیں

گھر ہو اونچا تو کیوں نکلیں باہر
چھت سے بستی کا نظارہ کر لیں

بخش دے اتنی بلندی ہم کو
کہ تجھے عرش پہ سجدہ کر لیں

شکل صحرا کی ہمیشہ جانی پہچانی رہے
میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ویرانی رہے

ساری سمتیں آ کے جس مرکز پہ ہو جاتی ہیں ایک
خم اسی جانب ہمیشہ میری پیشانی رہے

آگے آگے میں ترا پرچم لیے چلتا رہوں
ارض دل پر میری قایم تیری سلطانی رہے

روشنی کو ہو مری ایسا کوئی ماخذ عطا
ذرّۂ ناچیز میں دن رات تابانی رہے

نیزہ و شمشیر و خنجر کی اگر افراط ہے
خون کی بھی میری رگ رگ میں فراوانی رہے

میری کشتی کو ڈبو کر چین سے بیٹھے نہ تو
اے مرے دریا ہمیشہ تجھ میں طغیانی رہے

غزلیں

عابدعلی عابد

یہ مہاجر کس قدر مجبور ہیں
زندہ رہکر زندگی سے زندگی سے دور ہیں
ان پہ ٹوٹا ہے مصیبت کا پہاڑ
بستیاں انکی ہوئیں ویران اجاڑ
رکھ کے دہشت گرد بیچاروں کا نام
فوج نے جینا کیا ان کا حرام
بچہ ہے بوڑھا ہے عورت مرد ہے
جو مسلما ں ہے وہ دہشت گرد ہے
ماننے والے یہ گوتم بدھ کے ہیں
دھرم کی رو سے مخالف یدھ کے ہیں
اہل برما دیکھنے میں سادہ ہیں
بربریت پر مگر آمادہ ہیں
ہم کو یہ کہتے ہوئے آتی ہے لاج
بٹ گیا قوم و مذ اہب میں سماج
کفر و دیں اک ساتھ رہ سکتے نہیں
برملا لیکن یہ کہہ سکتے نہیں
دہر میں ہر جا بپا ہے کربلا
قتل انساں شیوۂ دنیا ہوا
زندہ ہوتا بعد ازاں اسلام ہے
کربلاؤں کا یہی پیغام ہے
باعث تکلیف ہوتا ہے سہی
کار ہجرت ہے نبیؐ کی پیر وی

اصغرشمیم

زمیں سے آسماں تک خامشی ہے
ہوا بھی اب مخالف بہہ رہی ہے

کسے بڑھکر گلے سے میں لگاؤں
کہ ہر جانب عجب بے چہرگی ہے

ابھی موجوں سے مجھکو کھیلنا ہے
لب ساحل یہ کیسی کھلبلی ہے

ستارے ڈوبنا چاہیں تو ڈوبیں
مقدر میں تو میرے تیرگی ہے

سنبھلنے ہی نہیں دیتی ہے دنیا
زمیں پاؤں سے اکثر کھینچتی ہے

درو دیوار پہ رونق ہے اصغر
مرے گھر آج پھیلی چاندنی ہے

شاعری

غزلیں

خالدعبادی

مسافر راستے میں ہے ابھی تک
نہیں پہنچا اجالا تیر گی تک

گلوں میں چاند کھلنے کے یہ دن ہیں
مگر کھلتی نہیں ہے اک کلی تک

ذرا سے درد اور اتنی دوائیں
پسند آئی نہیں چارہ گری تک

برہنہ جسم پر دو چار دھبے
تماشا دیکھتے ہیں اجنبی تک

وہ ایسی قیمتی شے بھی نہیں تھی
لٹی تو یاد آتی ہے ابھی تک

لکھا خنجر سے تیرا نام دل پر
ہمیں آتی نہیں دیوانگی تک

اسے تصویر کرنے کی لگن میں
عبادی بھول بیٹھے خود کشی تک

قیامت کا گزرنا کب نہیں ہے
چمن میں شور بے مطلب نہیں ہے

تمہارے ساتھ تو ایسا نہیں تھا
وہ خالق ہے مرا جو رب نہیں ہے

جہاں جاؤ وہی سر پر لٹکتی
کوئی محفوظِ تیغِ شب نہیں ہے

تھکے جاتے ہیں سب راہی تمہارے
کہیں رستہ کہیں مرکب نہیں ہے

خزاں بھی جس سے رشکِ موسمِ گل
یہاں ایک شے تھی لیکن اب نہیں ہے

نہ جانا اس کی باتوں پر عبادی
بڑا موذی ہے چارہ لب نہیں ہے

شاعری

غزلیں

نبیل احمد نبیل

عکس اُس کا نہ سہی، عکس کا ثانی تو رہے
آنکھ کی جھیل میں ٹھہرا ہُوا پانی تو رہے

اِک حسیں یاد کا مُرجھایا ہُوا پھول سہی
گھر کے آنگن میں کوئی چیز پُرانی تو رہے

اِک شکن اِس لیے بستر کی سنبھالی ہوئی ہے
کوئی ساعت شبِ ہجراں میں سہانی تو رہے

زندگی جس کے سہارے پہ گزاری جائے
کوئی خط اُس کا، کوئی ایک نشانی تو رہے

اِس لیے ہر نئی کاوش میں لگے رہتے ہیں
اپنا افسانہ رہے، اپنی کہانی تو رہے

میں نے کب اُس سے کہا ہے کہ حقیقت بن جائے
میرے اِقرار میں وہ شخص زبانی تو رہے

دل جلا کر ہی سہی، بارش میں نہا کر ہی سہی
اپنے احساس میں کُچھ دیر جوانی تو رہے

یہ الگ بات کہ وہ شخص ملے یا نہ ملے
وہ کہانی کی طرح ہے، وہ کہانی تو رہے

اِس لیے خاک سے رکھتا ہوں تعلق اپنا
اِس زمانے سے مرا ربطِ زمانی تو رہے

یہ الگ بات وہ منزل پہ نہ لے جائے نبیل
راستے کی مری شوریدہ بیانی تو رہے

بس یہی صورتِ احوال خُدا سے مانگی
کوہساروں کی صدا اپنی صدا سے مانگی

ہر طرف دُھوپ اُتر آئی مرے آنگن میں
میں نے بارش جو کسی وقت گھٹا سے مانگی

اپنی مرضی سے کوئی چیز نہ مانگی میں نے
جو بھی شے مانگی فقط اُس کی رضا سے مانگی

پھیل جاتا ہے کوئی حبس مرے چاروں طرف
جب بھی آسودگی تھوڑی سی ہَوا سے مانگی

ہم نے اُس ذات کو اُمّید کا مرکز رکھّا
کوئی بھی چیز کہاں خلقِ خُدا سے مانگی

اُس کے غمزے سے کیے سانس معطر اپنے
زندگی کے لیے مہکار ادا سے مانگی

ہم نے مانگا ہے زمانے کو دُعاؤں میں جُدا
اور پھر اُس کی دُعا ہم نے جُدا سے مانگی

زرد ہوتے ہوئے ارمانوں کی شاخوں کے لیے
خون کی سُرخی سدا رنگِ حنا سے مانگی

ہم سا سادہ ہے کہاں اور زمانے میں نبیل
سادگی اپنے لیے مکروریا سے مانگی

شاعری

غزلیں

پی پی سریواستورند

جو لوگ گُلاہوں کو خُدا سمجھے ہوئے تھے
دیمک زدہ ماحول میں کھونٹی پہ ٹنگے تھے

اُلجھن وہی، تناؤ وہی، مُشکلیں وہی
حالات مگر ننگے بَدن بیٹھے ہوئے تھے

سوداگرانِ وَقت سے دستار چھین کر
کچھ لوگ تھے جو اپنی اَنا بیچ رہے تھے

بیٹھا ہوا ہے بھیڑ میں دَستار سنبھالے
ہم اس اَنا پرست سے کل رَات مِلے تھے

رشتوں میں اب خلوص کی گنجائش کہاں
اپنوں نے بھی دالان میں پتھراؤ کئے تھے

مدّت کے بعد چین سے کل رات سو گئے
وہ لوگ جو صدیوں کی تھکن اوڑھے ہوئے تھے

اے رنؔد اس کو کوئی مُہاجر ہی پڑھے گا
دیوار پہ دیمک نے جو حالات لکھے تھے

صَدا و شور میں اک فاصلہ لے کر آؤ
قرابتوں کا وہی سلسلہ لے کر آؤ

وہ آندھیاں، وہ سمندر، وہ بادباں، وہ طَناب
رُتیں وہی ہیں، نیا حادثہ لے کر آؤ

وہ عکس جس میں ہو وجدانِ کیفِ تنہائی
ہمارے قد کا وہی آئینہ لے کر آؤ

عجیب حَبس ہے، آندھی ہے پَر سمیٹے ہوئے
سو شَاخ شَاخ نیا زَلزلہ لے کر آؤ

وہ خامشی، وہ اندھیرے، وہ بے گھری، وہ جُنوں
سُلگتی رُت ہے، نیا مشغلہ لے کر آؤ

جہاں جہاں سے بھی گُزرا ہو درد کا مُوسم
وہاں وہاں سے جنوں قافلہ لے کر آؤ

وہ چشمکیں ہیں ادب میں نہ طنز ہے اے رنؔد
تمسخرانہ کوئی وَاقعہ لے کر آؤ

غزلیں

شاعری

جنوں اشرفی

جنوں شوق سلامت نہ حوصلہ باقی
ہوائے دشت میں گم ہو گئی صدا باقی
خلوص، مہر و مروت نہ ہے وفا باقی
فریب و مکر تعصب ریا دغا باقی
سفر دراز تسلسل بھی تیرگی کا ہے
نہ ہم سفر نہ ہے روشن کوئی دیا باقی
عجیب شہر تعصب میں آ گیا ہوں میں
نہ کوئی چشم مروت نہ آشنا باقی
کہاں سکون حیات کو حاصل
کہیں نشاط و مسرت کی ہے گھٹا باقی
نظر نہ دل میں رہا ہے وہ جوش ہی پہلا
مگر ہنوز محبت کا ہے نشہ باقی
گمان ابر پہ اتنا نہ کیجئے صاحب
ابھی تو دھوپ کا لمبا ہے مرحلہ باقی
جنوں اسی کو ریاضی میں صفر کہتے ہیں
نہ ابتدا کا نشاں ہے نہ انتہا باقی

رفیق ساجد

خوں سے اس پیڑ کو سینچو تو ثمر آئے گا!
نثر کو شعر میں رچنے کا ہنر آئے گا

''اب مرا لال بھی ہوتا ہے شہیدوں میں شمار''
اس کی ماں کہتی ہے ''اب خوں سے وہ تر آئے گا''

ہو کڑی دھوپ بھی غم کی تو سفر ترک نہ کر!
راہ میں چھاؤں لیے کوئی شجر آئے گا

پیار حیواں بھی سمجھتا ہے اگر پیش کریں
پیڑ پر ہے تو زمیں پر وہ اتر آئے گا

نامۂ شوق ترا لے کے کبوتر پہنچے!
دیکھنا لے کے کوئی اچھی خبر آئے گا!

راستے سارے گزرتے ہیں یہیں سے ہو کر
صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر آئے گا

حل طلب ڈھیروں مسائل ہیں وطن میں ساجدؔ
سر کا سیلاب تو ہر سمت نظر آئے گا

نظم

پروین شیر

برف کی مورتی

برف کی آندھیاں
چیختی، دھاڑتی
ایک ہیجان میں
شہرجاں کی فصیلوں پہ یوں
حملہ آور ہوئیں
اک دھماکہ ہوا
سب شجر گر گئے
ہر مکاں ڈھے گیا
در دریچوں کے ٹکڑے ہوئے
جا بجا آب جو منجمد ہوگئی
ہر گلی یخ سفیدی میں یوں چھپ گئی
برف کی ریت کا ڈھیر سارا نگر ہوگیا
اور اس سے تراشی گئی
اک چمکتی ہوئی برف کی مورتی
کام آتی ہے بچوں کے ہر کھیل میں!!

شاعری

نظمیں

شارق عدیل

معموں کی سرحد

ہر شب میرے حسین خواب پرندے
میری خواب گاہ سے اڑ کر
تمھارے جمال سمندر کی طرف
کوچ کر جاتے ہیں
اور میں
ان کی آمد کے اضطراب میں
بستر کی شکنیں
درست کرتا رہتا ہوں
صبح دم
جب یہ واپس آتے ہیں
میں روح کی تشنگی مٹانے کے لیے
ان کے سیراب جسموں کو
اپنی آنکھوں سے سہلانے لگتا ہوں
نا تمام خواہشوں کے درمیاں
معموں کی سرحد
ابھی تک نہیں ڈھ سکی ہے
اور میں
تمھارے جمال سمندر کا
ساحل نہیں بن سکا ہوں

پرائیویٹ ہوسپٹل

اسپتال کے اندر
مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد
دیکھ کر
ڈاکٹروں کے چہروں کی چمک بڑھ گئی ہے
نرسوں کے پیروں کی گردشیں بھی تیز ہو چکی ہیں
مریضوں کی چیخ و پکار پر
قابو پاتے ہوئے
نیند کے انجکشن
ماحول کو پرسکون بنانے میں
مدد کر رہے ہیں
آپریشن تھیٹر سے مریضوں کے مردہ بدن
ڈسچارج کیے جا رہے ہیں
پورے شہر میں
اموات کی کثرت سے
ہیجان پھیل چکا ہے
مافیا ڈان
اوداس کا گروپ
قلعہ نما کوٹھی میں
جشن مسرت منانے میں مصروف ہے

محبوب پاشا اعظمی

افسانہ

آصفہ

جس کہانی کا میں ذکر کررہا ہوں وہ ایک کشمیری آٹھ سالہ بچّی ہے اس کا نام آصفہ بانو ہے اور یہ اسی کی کہانی ہے میں یکدم سے حال کے واقعات میں الجھ گیاہوں۔ جو کہانی نانی یا دادی سے سنی تھی اس کے ماضی کا کوئی پس منظر تھا اور نہ ہی پیش منظر مگر ہوا یوں ہی تھا !

" اس دن ؟ ۔۔ اچانک چند درندے آصفہ پر ۔۔ اس ننھی سی جان پر جپٹ پڑتے ہیں اور اس ننھی سی بچّی کو اٹھاکر اسی گاؤں کے ایک مندر میں قید کر دیتے ہیں اور باری باری اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔۔اتنا ہی نہیں اِن درندوں نے اپنے رشتہ دار اور دوستوں کو نیوتا دیکر پڑوس کے گاؤں سے بھی بلالیا اور پولیس کو بھی عام دعوت تھی کہ وہ بھی مزا لے لیں ۔

شاید اسی کو بلات کار کہا گیا ہے اور اب انڈیا میں یہ کامن ہے۔کمزور طبقات کی لڑکیوں کی آبرو اس وقت خطرے میں ہے۔اور وحشی درندوں کے حوصلے بلند ہیں۔ان کی پشت پناہی ہو رہی ہے اور انہیں جو توں کی بجائے پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے اور ایسے ہی لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں! اب تو بڑے شہروں دہلی ممبئی کولکتہ میں شام ہوئی کہ عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہوگیا ہے۔اس میں دیسی اور ویدیسی عورتیں ، لڑکیاں اور کم سن بچّیاں سب شامل ہیں۔۔ اِتنے بڑے وشال دیس میں ہر ایک منٹ میں ایک ریپ تو ضرور ہوتا ہے ! اور زیادہ تر کیس ریپ کےساتھ مرڈر کے ہیں! ریپ کرنے کے بعد مرڈر ؟ کیوں ؟ کیا یہ ضروری ہے ؟ یہ ایک زانی ہی بتا سکتا ہے (اور وہ پکڑا کہاں جاتا ہے جو اس کا جواب دیتا) ! اگر پکڑ میں آ بھی جائے تو عدالت اس سے یہ کیوں نہیں پوچھتی" بھئی ریپ کیا اور اپنی کھجلی مٹا لی۔۔ابلا ناری کو جانے دے دیتے کیا اس مجبور اور بےبس کا قتل ضروری تھا ؟"

نانی کہانی سنا رہی تھیں۔دادی کہانی سنا رہی تھیں۔" خوشگوار دن و رات تھے ! کاش میں پانچ سال کا ننھا سا بچّہ ہی رہتا۔۔۔نانی زندہ ہوتیں۔دادی زندہ ہوتیں اور میں پانچ سال کا وہ ننھا سا بچّہ ہی رہتا ۔ اور روز رات کہانی سنتے سنتے سو جاتا !

نانی کہانی سنا رہی تھیں۔ دادی کہانی سنا رہی تھیں ۔ اس چھوٹی سی جان کو ڈرا ڈرا کر بیہوشی کی ڈرکس دے کر اس کی عصمت کو لوٹ رہے تھے ۔۔۔ ۔!

یہ حال کی کہانی ہے ۔ اب نانی ماں کہاں ؟ اب دادی ماں کہاں ؟ ان کا انتقال ہوئے ایک زمانہ ہوچکا ہے ۔ دادی ماں اور نانی ماں کی کہی ہوئی کہانی تو یوں تھی : ایک شاہزادی جنگل میں

اکیلی بھٹک رہی تھی۔۔ وہ راستہ بھول گئی تھی اور اپنی سہیلیوں سے بچھڑ گئی تھی اور اس کے سپاہی بھی پریشان ۔ اِدھر اُدھر جنگل میں شہزادی کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔۔ نانی کہانی سنا رہی تھیں! دادی کہانی سنا رہی تھیں ۔ شہزادی روتی جاتی تھی اور اپنی سہلیوں کے نام لے لے کر پکار رہی تھی چلاّ رہی تھی اور اس کی مدد کو کوئی نہیں تھا ! وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے دعا مانگ رہی تھی رو رہی تھی کہ اسی وقت ایک خوبصورت نوجوان شہزادہ وہاں آجاتا ہے

حال کی کہانی ہے ۔۔۔ وہ ننھی سی معصوم آٹھ سال کی بچّی آصفہ بانو وہ بھی رو رہی تھی چلاّ رہی تھی کہہ رہی تھی انکل مجھے چھوڑدو انکل مجھے چھوڑدو ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو انکل میں آپ کی بیٹی کی عمر کی ہوں۔۔۔ آپ کی بیٹی ہوں ۔ مجھے۔۔۔ یہ کیا ؟ وہ معصوم بیہوش ہوجاتی ہے ۔اس معصوم پر ترس کھانے والا اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا ۔۔ کوئی شہزادہ نہیں آیا !! اس کا ریپ ہوتا رہا ۔۔اس ننھی سی بچّی کے باپ کی عمر ۔ چاچا اور بھائی کی عمر کے لوگ اس معصوم کی عزّت کو تار تارکر رہے تھے لوٹ رہے تھے اور مزالے رہے تھے۔ انسانیت کا خون ہورہا تھا ! اِن درندوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے بھی گھروں میں آصفہ کی عمر کی بچیاں ہیں اور کل کے روز اِن بچیوں کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا ہے ؟

نانی کہانی سنا رہی تھیں ۔ دادی کہانی سنا رہی تھیں ۔۔ لیکن سب بچّے سوگئے تھے ۔۔ پھر کیا ہوا کہنے والا ایک بھی نہیں جاگ رہا تھا سب سو گئے تھے۔ نانی کہاں سو تی ؟ وہ تو اپنی کہانی سنائے جارہی تھی کوئی سنے یا نا سنے ! " وہ نوجوان شہزادی کو اپنے محل میں لے آیا۔۔ وہ نوجوان انسان نہیں تھا دراصل وہ ایک کالا دیو تھا۔جو انسان کی شکل میں تھا شہزادی اس نوجوان کا اصلی روپ دیکھ کر بیہوش ہوگئی ! جب شہزادی کو ہوش آیا وہ کالا دیو وہاں نہیں تھا ۔شہزادی کو اندازہ ہوا کہ وہ کالے دیو کی قید میں ہے اور شہزادی سوچنے لگی کس طرح اس کالے دیو کی قید سے آزاد ہو ؟ اسے اپنی ماں کی بتائی ہوئی نصیحت یاد آتی ہے مصیبت میں دعا کام آتی ہے اور وہ آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگنے لگی۔۔ پھر کیا دیکھتی ہے کہ ایک سفید پوش بزرگ منش براق پر سوار آتے ہیں اور شہزادی کو کالے دیو کی قید سے رہا کر لے جاتے ہیں ! اور شہزادی اپنے محل اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

اب جب کے انسان وحشی ہوگیا ہے اور ان کمسن لڑکیوں کے ساتھ بربرت کا ننگا ناچ ہورہا ہے دادی اور نانی کی کہانی باکل بکواس لگتی ہے۔ فراڈ لگتی ہے! وہ آٹھ سال کی ننھی منھی آصفہ اپنی بکریاں چرا رہی تھی اس کا یہ روز کا معمول تھا مگر کسے پتہ تھا کہ اس دن اچانک دھرم والے لوگ ایسا کام کرینگے۔۔بھگوان پراسن ہونگے اور ایشور اس دھارمک کام سے خوش ہوگا ؟ نہیں۔۔۔ یہ دھارمکتا

کہاں سے آئی ؟ جس نے بھی یہ گناہ کیا ہے ۔ پاپ کیا ہے بالکل غلط کیا ہے۔معصوم اور نابالغ بچوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانا۔ یہ کونسا مذہب ہے ۔ کون سا دھرم ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے ؟ زانی ۔۔۔زانی ہے اس نے زنا کیا ہے ، انسانیت کا خون کیا ہے!

ایک منتری کی آنکھیوں میں یہ المناک حا دثہ ' اجتماعی زنا' معمولی سا ہے اور ان کا کہنا ہے اس حادثہ کو لیکر اس کے بارے میں زیادہ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں! اگر اِس منتری کی بچی کے ساتھ زنا بالجبر ہوتا تو وہ کیا کرتا ؟ ایک بڑا سا سوال ! اس کا جواب شاید اس منتری کے پاس نہیں ہوگا ! اس لئے وہ ایسا بھاشن دیا تو ہے مگر وہ نہیں جانتا یہاں کا حساب یہاں ہی دینا ہوتا ہے !

کیا اب یہ زانی ۔ یہ زنا بالجبر کرنے والے ۔ وحشی بیمار ذہنیت والے ایک نارمل زندگی جی سکے گے ؟ ایک ایسا سوال ہے شاید اس کا جواب ہے بھی یا نہیں۔۔۔معلوم نہیں ! لگتا ہے سعادت حسن منٹو کا زمانہ پھر سے لوٹ آیا ہے ۔ایسے ہی حالات پر ایسے ہی ماحول میں منٹو نے کئی کہانیاں گھڑی تھیں اور میری یہ کہانی منٹو کی کہانیوں سے الگ نہیں ہے۔۔منٹو کی کہانیاں آج بھی زندہ ہیں اورشاید میری یہ کہانی بھی ؟

کہانی اب آگے بڑھتی ہے!

زنا کے کچھ دنوں بعد ۔ ایک زانی۔۔ ۔۔ایک زنا بالجبر کرنے والا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا چاہتا ہے مگر بار بار کوشش کے با وجود وہ اپنی بیوی کو مطمئن کر پاتا ہے اور نہ خود کو ۔۔۔ ایسا لگتا ہے کچھ کرنے کی طاقت کسی نے اس سے چھین لی ہے وہ پہلے جیسا مرد نہیں رہا ہے! اور جب بھی کوشش کرتا ہے اسکو آصفہ آنکھوں کے سامنے کھڑی ملتی ہے ۔ وہ اپنے آپ کو معذور اور کمزور محسوس کرتا ہے اور اس کی بیوی اسکی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوتی ہے اور اضطرابی کی حالت میں پوچھنے لگتی ہے ۔۔ اتنے برسوں سے مباشرت کرتے رہے ہیں اور یہ اچانک اِسے یہ کیا ہوگیا ہے! جو کرنا چاہتا ہے وہ کر نہیں سکتا ؟ اسی کی بیوی سے رہا نہیں گیا اور وہ آخر اس سے پوچھ لیتی ہے "کیوں ؟ اپنی مردانگی کہاں گوا آئے ہوں ؟ میں دو ہفتوں سے دیکھ رہی ہوں اب تم مرد نہیں رہے ۔ میں تمہیں مرد سمجھتی تھی مگر اب تم میرے کوئی کام کے نہیں رہے !"وہ پشیمانی کی حالت میں پوچھتا ہے۔" یہ کیا کہہ رہی ہوں؟

صحیح تو کہہ رہی ہوں ۔۔۔ اب تم وہ پہلے جیسے مرد نہیں رہے ! پچھلے دو ہفتوں میں تم نے ایک بار بھی مجھے مطمئن کر پائے اور نہ ہی خود کو ساٹس فائی ! تم مرد ہوتے ہوئے بھی۔۔۔۔۔ !! مردانہ کام نہیں کر پا رہے ہو !!

یہ سننا تھا کہ وہ اپنی بیوی پر ہاتھا اٹھا یا ہی تھا کہ اس کی بیوی اس کا ہاتھ روک لیتی ہے ۔پکڑ لیتی ہے اور کہنے لگتی ہے " یہ مردانگی کسی اور کو دیکھانا اور یہ چوڑیاں پہن لو " یہ کہتے ہوئے وہ اپنے

چوڑیاں بھرے دونوں ہاتھ اس کی اور بڑھا دیتی ہے ! یہ جھگڑا اتنا طول پکڑتا کہ دونوں میں طلاق ہوجاتی ہے !دوسرے زنا بالجبر کرنے والوں کی حالت بھی اس سے الگ نہیں تھی۔ دو چار کی بیویاں تو اپنے ریپسٹ شوہروں سے ان کی نامردی کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کیں ۔ ایک تو اپنے ریپسٹ شوہر سے الگ ہو جاتی ہے اور اتنا ہی نہیں غیر مرد کا بستر گرم کرنے لگتی ہے ! فیملی لائف بربادی کی اور پیر پھیلانے لگتی ہے ۔ ایک ریپسٹ شوہر کی بیوی اپنی بچّی کو لیکر گھر بار چھوڑ چلی جاتی ہے! اس طرح ریپسٹ اپنی موت کو اپنی آنکھیوں سے دیکھتے رہے گے پر۔۔انہی موت نہیں آئیگی اور وہ تڑپ تڑپ کر گھونٹ گھونٹ کر مرجائینگے !آصفہ اپنا انتقام لیگی ۔۔۔۔آصفہ اپنا انتقام لے رہی ہے !!

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

رند سرشار

افسانہ

بھاگ متی

ایک آواز جو بالکل اجنبی تھی لیکن میرے کانوں کو مانوس کیوں لگ رہی تھی! ایسی آواز جو ایک بکھرے ہوئے سماج، ایک منتشر تمدن اور گمشدہ تہذیب کے کھنڈروں میں بازگشت طرح سنائی دے رہی تھی یہ کیسے ممکن ہے لگ بھگ نصف صدی پہلے چلنے والی ایک آب جو اب راکھ کے ٹھنڈے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہے اس کے نیچے کیا ایک چنگاری سلگتی رہ سکتی ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میرا سر چکرانے لگا۔

ہر روز کی طرح آج بھی میرے آفس کی میز پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی اسے سن کر یقیناً کھو گیا کہ یہ میرے ڈائریکٹر کا فون ہے جو ہمیشہ کی طرح بڑے کرخت لہجے میں کہنے لگا کہ وہ جس کاروائی میں دلچسپی رکھتا ہے اس کی فوری یکسوئی کر دی جائے اس نادر شاہی احکام کی تعمیل میں مجھے اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑے گی۔ میرا اسسٹنٹ سیکریٹری مسٹر کرشنما چاری میرے آگے کھڑا اس ہدایت کو سن کر اپنی موٹے موٹے شیشوں والی عینک ہے گھور گھور کر مجھے دیکھے گا اور پھر ''ایس سر'' کہتا ہوا اپنے آفس ہال میں جائے گا اور اپنے تحت کے اسٹاف پر برس پڑے گا ایک بیزاری کا احساس لیے میں نے ریسور اٹھایا اور کان کو لگا کر کہا

''ہیلو''

''ہیلو کیا آپ کے ڈپٹی سکریٹری مسٹر نعیم فون پر ملیں گے'' ایک آواز جس کو میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن اس کے ترنم سے میرے کان آشنا کیسے؟ ایک آواز ایسا محسوس ہو رہا تھا کئی برسوں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے اس آواز کے جلترنگ نصف صدی کے پہلے میرے کانوں میں بجتے تھے اتنا لمبا عرصہ فاصلہ طے کرتے کرتے ایک انسان تھک پاتا ہے اور کسی سائے کے نیچے بیٹھا اپنی آخری سانس تک سننا چاہتا ہے میں کچھ دیر ہکا بکا رہ گیا اور اپنے حواس کو یکجا کرتے ہوئے۔ جواب دیا

''میں نعیم ہی فون پر ہوں''

''تم نعیم ہو؟ نعیم میں کملا پاٹل بول رہی ہوں تم نے پہچانا مجھے؟ ادھر سے آواز آئی کملا پاٹل؟ میں اس نام کی کسی خاتون سے واقف نہیں تھا ہاں میری اسٹاف میں کملاوتی ایک ٹائپسٹ تھی جو تین سال پہلے ایک ٹامل نژاد لڑکے کے ساتھ مدراس چلی گئی تھی اور وہ اردو کہاں بولتی تھی۔ وہ تو تلگو میں بات کرتی اور انگریزی میں ٹائپ کرتی تھی پھر آواز آئی ''ہیلو نعیم تم اپنے آفس کی بلڈنگ سے نیچے آؤ، میں یہاں ویمل شوروم میں شاپنگ کر رہی ہوں باز و میں شالیمار پارلر ہے اگر آجاؤ تو وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے'' کتنی بے تکلفی تھی ان جملوں کملا پاٹل نے پھر کہا ''ارے تم وہی نعیم ہو ناجو لنگم پلی میں رہتے تھے۔ میں نے کتنی مشکل سے تمہارا پتہ پایا ہے کیا تم نیچے نہیں آسکتے؟''

میں اپنے ایئر کنڈیشن چیمبر میں بیٹھا تھا لیکن اس آواز کو سن کر میرے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں اور میرا سر گھومنے لگا۔ میں نے رسیور رکھ دیا اور سامنے والی کھڑکی میں لگے شفاف شیشوں سے باہر حسین ساگر کے گہرے نیلے نیلے پانی کو دیکھنے لگا میں روز اس بلڈنگ کی ساتویں منزل پر واقع اپنے چیمبر میں بیٹھا کے ان موجوں کو دیکھتا ہوں جو اچھل اچھل کر کنارے تک آتی ہیں اور پھر بے بس ہو کر واپس لوٹ جاتی ہیں ان موجوں کی بے بسی پر مجھے رحم آتا تھا لیکن آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مچلتی موجیں ساحل کو پھلانگ کر مجھ تک پہونچ جائیں گی اور میں بانہیں ڈالے مجھے گہرے نیلے پانی میں لے جائیں گی اور ساگر

میں ڈبو دیں گیں میں حسین ساگر کے تموج کو دیکھتے دیکھتے اپنے ہی ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

حسین ساگر شہر حیدرآباد کے بانی سلطان قلی قطب کے دور میں ایک صوفی صفت انجینئر حضرت حسین شاہ ولی نے موسیٰ ندی کی ایک شاخ کو روک کر چار سو سال پہلے تعمیر کیا تھا اور اسی ساگر کے مغربی کنارے اور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے درمیان حضرت حسین شاہ ولی کی درگاہ ہے جہاں آج بھی عقیدت مند پھول چڑھاتے اور منتیں مانگتے ہیں اسی درگاہ کے سامنے ایک کچی سڑک بہت دور جا کر ممبئی شاہراہ سے مل جاتی ہے اسی سڑک کو چند میل پار کرنے کے بعد ایک خوب صورت وادی تھی اور اسی وادی میں تین اونچے اونچے ٹیلے تھے جو کوہ وندھیاچل کے سلسلے کا ایک حصہ تھے۔صدیوں کے ردوبدل نے ان ٹیلوں کے درمیان ایک قدرتی پل بنا دیا تھا اور ان کے اطراف کیکر کے درخت تھے، نیم اور املی کے سایہ دار درخت تھے، آم اور شہتوت کے تھے۔مغرب کی جانب گہری سبز ہریالی میں دو بڑے بڑے چشمے تھے جن کا پانی اُبل اُبل کر تیڑھی میڑھی نالیوں سے بہتا ہوا حد نظر تک پھیلے ہوئے دھان کے لہلہاتے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا جنگل میں ہرے ہرے طوطے پٹر پٹر چونچلے کرتے پھرتے تھے فاختا اڑان بھر کر زمین پر اترتیں اور مٹکتے مٹکتے چلتیں، سفید سفید ہنس دھان کے کھیتوں میں بڑی متانت سے ٹہلتے اور پھر گرما میں آم کے درختوں پر کوئلیں کوکتیں تو ساری وادی خاموش ہو جاتی۔

ان تینوں ٹیلوں پر تین بڑے بڑے بنگلے تھے ایک پنجابی پٹھان رحیم بخش خاں کا تھا دوسرے میں ان کے گجراتی منیجر رام پرشاد پاٹل مقیم تھے اور تیسرا ہمارا تھا، وادی جس جگہ ختم ہوتی وہاں ایک مسطح زمین کا علاقہ تھا جس کی دوسری سرحد لنگم پلی ریلوے اسٹیشن سے ملتی تھی۔دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ہندوستان میں بھی دوسری اشیا کی طرح آئیل پینٹ بھی عنقا ہو گیا تھا رحیم بخش خاں کی چالاک نظروں نے اس جگہ کا انتخاب ایک آئیل پینٹ فیکٹری قایم کرنے کے لیے کیا تھا انھیں یہ زمین سستے داموں میں مل گئی تھی اور پھر اطراف کے دیہات سے کم اجرتی مزدور بھی مل سکتے تھے اور مال کے حمل ونقل کے ریلوے اسٹیشن بھی قریب تھا۔انہوں نے گجرات سے رام پرشاد پاٹل کو بلوایا جو آئیل پینٹ کی تیاری میں جرمنی کے تربیت یافتہ تھے۔رحیم صحیم پنجابی پٹھان رحیم بخش خاں اپنے وطن سے پندرہ سو میل دور جنوب کے علاقے میں درمیانی قد کے گورے چٹے رام پرشاد کے ساتھ سیکڑوں مزدوروں کو لیکر اپنے کارخانے کی تعمیر میں مصروف رہتے۔رحیم بخش خاں کے کوئی دس بارہ بچے بچیاں تھے جو عمر میں ہم سے بہت بڑے تھے۔رام پرشاد پاٹل جب یہاں آئے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی اور ایک بچی کملا بھی ان کے ساتھ یہاں آکر بیچ کے بنگلے میں رہنے لگے کملا جب یہاں آئی تو اس کی عمر بمشکل دس سال کی ہوگی ایک سرخ وسفید رنگ کی نازک اور معصوم لڑکی اس کی ماتاجی اکثر بیمار رہتی اور ہر روز گجراتی وضع کی ساڑی پہنے سر پر پلو اوڑھے اپنے بنگلے سے آہستہ آہستہ ہمارے گھر آتیں اور میری نانی ماں سے گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔اس مقام پر ایک عیسائی مشنری نے ایک اسکول کھول رکھا تھا جہاں رحیم بخش خاں کے بچے اور بچیوں کے ساتھ میں بھی پڑھتا بلکہ کملا جب یہاں آئی تو اس کو بھی اس اسکول میں داخلہ دلا دیا گیا فیکٹری کی وین ہمیں روز اسکول لے جایا لایا کرتی تھی میرے نانا جان پولیس کے ایک رٹائرڈ عہدہ دار تھے ان کی ساری زندگی اضلاع اور دیہاتوں میں گزری تھی اس لیے وہ شہر کی گہما گہمی سے دور وادی کے اس ٹیلے پر شاندار مکان تعمیر کر کے رہنے لگے میرے والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اس لیے میں اپنے نانا اور نانی کے ساتھ لنگم پلی ہی میں رہتا تھا نانا جان کملا کو بے حد چاہتے تھے کسی دن وہ نہ آتی تو بڑے میاں پاٹل کے گھر جاتے کملا کی ماتاجی ان کے پیر چھوتی اور میرے نانا کملا کی انگلی پکڑ کر اپنے گھر لاتے۔رحیم

بخش خاں کے بچوں سے ہم کو دوری اچھی لگتی تھی۔ کیوں کہ عمر میں وہ ہم سے بڑے تھے۔ کملا تو ان کے گھر جانے سے تک کتراتی تھی۔

میں فرصت کے وقت اپنے مکان کی بالائی منزل کے پچھلے ورانڈے میں بیٹھا وادی کی سرسبز وسعتوں پر نظر ڈالتا جس میں کیکر کے درخت تھے، آم اور شہتوت کے باغ تھے وادی کے چشموں کا پانی ابل ابل کر دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا اور اس سے لگی مسطح زمین پر سیکڑوں مزدور سمنٹ اور کنکریٹ کے تیار ہونے والے کارخانہ کی دیواروں اور سیاہ کثیف دھواں اگلنے والی چمنیوں کی تعمیر میں مصروف رہتے۔

وقت کے نپے تلے قدم برسوں کا احاطہ کرتے تھے ہم روز اسکول جاتے اور شام گھر آنے کے بعد آپس میں کھیلتے ایک دن میں نے محسوس کیا مجھے دیکھ کر کملا کی معصوم اور خوب صورت نظر وں میں شوخی اور چہرے پر شرم کی سرخی آجارہی ہے یہ میری نظروں کا قصور تھا یا کملا میں ہونے والی تبدیلی۔ میں کچھ نہ جان سکا کھیل کے بعد ہمارے ٹیوٹر ہیمنت راو ہم دونوں کو ٹیوشن پڑھانے آتے کملا کی ہینڈ رائٹنگ بڑی خوب صورت تھی جب وہ لکھتی تو ایسا معلوم تھا جیسے موتی پرو رہی ہے میرا خط اتنا ہی بھدا تھا اور راؤ صاحب یہ دیکھ کر میری ہتھیلی پر بید کی لکڑی سے شپا شپ مارتے اور یہ کہتے اس لڑکی کو دیکھو کتنا اچھا لکھتی ہے اور تمہارا خط بالکل کیڑے مکوڑوں کی طرح ہے راؤ صاحب کے ان جملوں کو سن کر میں کملا سے بات کرنا چھوڑ دیتا وہ مجھ سے چھیڑ چھیڑ کر بات کرتی لیکن میں ٹکا سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ ایک دن راؤ صاحب کملا کی ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر لال پیلے ہوئے اور پوچھنے لگے تم نے اس لڑکے کی صحبت میں اپنے خط کو بگاڑ لیا ہے یاد رکھو میں تمھیں بھی سزا دوں گا کملا نے چپکے اپنی ہتھیلی راؤ صاحب کے آگے رکھ دی۔ راؤ صاحب بگڑ گئے اور کہنے لگے تم بہت اچھا پڑھتی ہو یہ لڑکا تم سے پانچ جماعت آگے ہے مگر اس کے خط کو دیکھو یہ نالائق ہے تم اس کے ساتھ نہ رہو یہ کہہ کر راؤ صاحب بڑ بڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں کملا کو غور سے دیکھنے لگا وہ نظریں جھکائے کچھ دیر چپ رہی پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگی نعیم مسٹر راؤ جب تمہاری ہتھیلی پر مارتے ہیں تو میری ہتھیلی میں درد ہوتا ہے۔ کملا کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی ہاں میرے دل کے قریب ایک کوندا سا لپکا میں جلد ہی گھر کی بالائی منزل کے ورانڈے میں آکر دادی کی وسعتوں کو دیکھنے لگا، وہی سر سبز و شاداب وادی اور اس سے لگی ہوئی مسطح زمین پر کارخانہ کے اونچے اونچے شیڈ، دونوں میں کتنا فرق تھا کتنا تضاد تھا ایک قدرت کے خوب صورت مظاہر اور دوسری طرف انسانی دماغ کی جادوگری ایک قدرت اور دوسرے انسان کی تخلیق دونوں ایک دوسرے مختلف تھے دونوں میں کتنا فاصلہ تھا کہاں دادی کا سہانا پن اور کہاں مشینوں کی گڑگڑاہٹ۔

جب فیکٹری تیار ہوگئی اور اس کی اونچی اونچی چمنیوں سے دھواں اٹھنے لگا تو اس وادی میں اڑنے والے طوطے، کہیں دبکے دبکے رہنے لگے، فاختیاں اڑان بھرنا بھول گئیں اور دھان کے کھیتوں میں متانت سے ٹہلنے والے ہنس اپنی گردنیں اونچی کر کے اس کالے اور کثیف دھویں کو حیرت سے دیکھنے لگے اور مشینوں کے شور میں کوئل کی پی ہو پی ہو گم ہوگئی۔ اس تبدیلی کو دیکھنے جب بیٹھا رہتا تو کملا میری پیٹھ سے لگی اور اپنا سر میرے کندھے پر ٹکائے گم سم پڑی رہتی۔ مجھے ماحول کی اس تبدیلی سے ایک خوف سا ہونے لگا اور یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔

ایک دن رام پرشاد پاٹل ہمارے گھر آئے اور میرے نانا جی سے کہا ''مولوی صاحب رحیم بخش خاں اپنی فیکٹری فروخت کر رہے ہیں، نانا جان جو حقہ گڑگڑا رہے تھے یکا یک چونک پڑے انہوں نے پوچھا ''کیوں؟''

پاٹل نے جواب دیا ''خان صاحب یہاں سے اپنے وطن لاہور منتقل ہونے والے ہیں ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔

اور سچ مچ رحیم بخش خان اپنے فیکٹری بیچ کر حیدرآباد سے چلے گئے۔

میں اکثر ورانڈے میں بیٹھا قدرتی مناظر اور انسان کے بنائے ہوئے نقلی ماحول کی اس تبدیلی کو دیکھتا رہتا ماحول کے اس تبدیلی سے ایک خوف کا بھوت میرا پیچھا کرتا رہتا ایسا معلوم ہوتا کچھ ہونے والا ہے کوئی طوفان آئے گا اور سب کچھ بہالے جائے گا جب قدرت کا حسن لٹتا ہے تو انسان انسان سے انتقام لینے لگتا ہے یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ایسے ہی احساس کو میں ایک دن ورانڈے میں گم سم بیٹھا تھا کملا چپ چاپ ادھر آئی اور میری پیٹھ کو لگ کر بیٹھ گئی اور اپنی گردن میرے کندھوں پر ڈال دی یہ معمول کی بات تھی اس کی پرواہ کیے بغیر میں دادی کے لٹے ہوئے حسن کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے کملا کے سسکیاں بھرنے کی آواز آئی اور پھر اس کے گرم گرم آنسوؤں سے میرا کندھا بھیگنے لگا پلٹ کر دیکھا تو کملا رو رہی ہے'' یہ کیا ہمیشہ کی طرح کرخت لہجے میں اس سے پوچھا کملا روتے ہوئے کہنے لگی ڈیڈی کہہ رہے تھے ہمیں بھی حیدرآباد چھوڑ کر جانا پڑے گا یہاں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ یہ سن کر پہلی بار میرے اندر کملا سے بے پناہ محبت کا جذبہ ابھر آیا میں اس کے نرم نرم ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر رونے لگا پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا کملا ایسا نہیں ہوسکتا تم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے، تم، تمہاری ماتا جی اور تمہارے ڈیڈی ہمارے گھر آجاؤ کوئی بھی تم لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا کملا کی معصومیت نے میری ان باتوں کا یقین کر لیا اور وہ مطمئن ہوگئی لیکن رام پرشاد پاٹل مختصر خاندان کو لے کر حیدرآباد سے چلے گئے۔ اس دوران فالج سے انتقال ہوگیا اور ہم بھی لنگم پلی چھوڑ کر شہر حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ شہر حیدرآباد سیاست کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا اور وہ شہر جس کی قلی نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کی یاد میں بسایا تھا، حیدرآباد ہندوستان کا دوسرا تاج محل یہاں نہ کوئی ہندو تھا اور نہ کوئی مسلمان سب کے سب حیدرآبادی تھے۔ ایک ملی جلی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کی علامت جو اس صدی کے چوتھے دہے کے ختم ہونے تک حیرت ناک طور پر باقی رہ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کے لوگ ہندو مسلمان میں بٹ گئے صدیوں کی جان پہچان، راہ رسم، دوستی اور محبت یکا یک نفرت میں بدل گئی میری طرح لاکھوں لوگ خود کو اس شہر میں اجنبی سمجھنے لگے یہ شہر جہاں چودہ پشتوں سے میں رہتا آیا ہوں میرے آبا و اجداد اسی میں دفن ہیں اس کی تعمیر اس کی رواداری اس کی مہمان نوازی اس کی ایک ایک رونق کو ہم نے سنوارا تھا میرے آگے ایک تہذیب مٹ گئی اور ایک حسین و جمیل کلچر تباہ ہوگیا۔

جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا دن میں کالج میں پڑھتا اور رات کو ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتا تھا دن بھر پڑھتا اس کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جب اخبار کے دفتر کا رخ کرتا تو سڑکوں اور بازار میں پر روز نئے نئے چہرے نظر آتے پرانے آثار مٹائے جا رہے تھے اور نئی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں ایک تہذیب کے مٹنے اور اس کی لاش پر دوسری تہذیب کو کھڑا کرنے کا عمل کتنا تکلیف دہ اور اندوھناک ہوتا ہے۔

عابد روڈ کے چوراہے پر ایک دن مجھے اپنے اسکول کا دوست ماجد الحسن مل گیا ایک قیمتی سوٹ زیب تن کیے ہوئے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا وہ ان ہنگاموں کی تاب نہ لاکر بارہ سال پہلے اپنے خاندان کے ساتھ لندن چلا گیا تھا۔ بارہ سال بعد ہم دونوں مل رہے ہیں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر لپٹ جاتے ہیں میں اسے پھینچتے ہوئے کہنے لگا میرے یار تو کہاں گم ہوگیا تھا ماجد اپنی بانہوں کی گرفت مزید سخت کرتے ہوئے کہنے لگا ایک ہفتہ قبل میں حیدرآباد کی مٹی کی خوشبو سونگھنے آیا ہوں اور روز اس فٹ پاتھ پر کھڑا ترا اور انصاری کا انتظار کرتا رہا مگر تم لوگوں کا کچھ پتہ نہ چلا یہ سوچ کر ہم تینوں کافی ہاؤز میں بیٹھیں باتیں کریں گے باتیں اپنے اسکول کے زمانہ کی باتیں ان تلخ حالات اور مصائب کی جو تم لوگوں نے

یہاں برداشت کیے اپنی اس غریب الوطنی کی جو میں لندن میں گزار رہا ہوں لیکن تم لوگوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہ شہر کیسا بدل گیا ہے کونسا راستہ کہاں جاتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا معلوم ہی نہیں ہوتا جانے پہچانے لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ یہ کہتے ہوئے ایک چمکیلی فئیٹ کار میں کسی کو جاتے ہوئے دیکھ کر ماجد پکارنے لگا، انصاری، انصاری میں نے ماجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا وہ انصاری نہیں ہے وہ تو بال ریڈی ہے جو فئیٹ کار میں جا رہا ہے۔ تمھارے انصاری کو وہ دیکھو فٹ پاتھ پر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھائے اس پر کچھ اوزار تھے میں ماجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا میرے دوست جب وقت بدلتا ہے تو ایسا ہوتا ہے تم انصاری کے چہرے کو دیکھو اس کے چہرے پر ساری تاریخ لکھی ہوئی ہے یہ کہتے ہوئے میں ماجد سے ہاتھ ملا کر آگے چلا گیا۔

آدھی رات کو جب میں اخبار کے دفتر سے نکل کر گھر واپس ہوتا تو اس شہر کی اندھیری سڑکوں پر مجھے پردہ لگی کچھ سائکل رکشائیں آہستہ آہستہ جاتی نظر آتیں میں اور ان کے پیچھے کچھ لوگ چلتے چلتے سودا کرتے ہیں اور پھر یہ رکشائیں رات کی ساعتوں میں گم ہو جاتی ہیں ان پردہ لگی رکشاؤں کے اندر کون ہے ان کے پیچھے کلثوم ہے ایک اونچے خاندان کی زرچشم اس کے پیچھے نجمہ ہے جو ایک تعلقدار کی بیٹی ہے اس کے پیچھے سلطانہ ہے جو ناگر جنا ساگر پر کام کرنے والے انجینئر کی بیٹی ہے، کلثوم، نجمہ، اور سلطانہ ان خاندانوں کی عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے گھر کی کھڑکیوں سے جھانک کر کبھی دیکھا بھی نہیں تھا کونسا راستہ کہاں جاتا ہے ان کو معلوم ہی نہیں تھا لیکن آج رات کے اندھیروں میں رکشاؤں میں بیٹھ کر اپنے جسموں کا سودا کرتی ہیں اور جہاں کہیں جانے تیار ہیں۔ انصاری کا چہرہ اور ان عورتوں کے سوکھے جسم جو ہر روز بکتے ہیں آج کی قومی فسطائیت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن پر زرخرید مورخین، اور کرایہ کے نظریہ سازوں کی نگاہ کبھی نہیں پڑے گی کیوں کہ اس حقیقت پر توجہ کرنے سے تاریخ کے تہ بہ تہ راز کھولنے لگتے ہیں شہر کے کونے میں تابھی شعر وسخن کی محفلیں جمتی ہیں، اجڑی اجڑی بے رونق خانقاہوں میں قوالی کی گونج سنائی دیتی ہے اور خدا کا نام لیکر اجتماعات ہوتے ہیں لیکن ان مظلوموں کی پذیرائی کرنے والے کوئی نہیں اس لیے کہ ہم ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں یہ اسی ماحول کے پالے ہوئے ہیں میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم مکمل کر لی اور ایک سرکاری محکمہ میں ملازم ہو گیا زندگی کے کئی نشیب وفراز کے برسوں بعد آج کملا کی آواز سنائی دی اور اس کے کہنے پر میں اپنے آفس کی بلڈنگ کے نیچے اُتر آیا وہ ویمل شوروم میں شاپنگ کر رہی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے نصف صدی کے بعد ہم مل رہے ہیں ایک بڑے انقلاب کے بعد جو صدیوں کے تہذیبی وتمدنی آثار کو بہالے گیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کملا بھی بوڑھی ہو چکی ہے کملا اب ایک فوجی عہدیدار کی بیوہ ہے جو پاکستان کی جنگ میں مارا گیا ہم ایک دوسرے کو سہارا دے کر شالیمار پارلر میں داخل ہوتے ہیں اور ایک کونے میں بیٹھ کر مدھم روشنی میں ایک دوسرے کے چہروں میں ان نقوش کو تلاش کرتے ہیں جو نصف صدی پہلے ہماری معصومیت کی عکاسی کرتے تھے۔ میں کملا کی آنکھوں میں اتر جاتا ہوں تاکہ اسی شوخی اور شرم کو تلاش کر سکوں جو برسوں پہلے اس کی آنکھوں میں چمکتی تھی اور جسے دیکھ کر میرے دل کے قریب ایک کوندا سا لپکتا تھا پتہ نہیں اس شہر وفا میں مجھے تلاش کرنے کملا کیوں آئی ہے اس شہر حیدرآباد میں جس کو قلی قطب شاہ نے چار سو سال پہلے اپنے محبوبہ بھاگ متی کی یاد میں بسایا تھا۔

☆☆☆

جو وہ لکھیں گے جواب میں

مکرمی ____ تسلیمات!

سب رس ستمبر 2018ء ملا ۔ قدوس جاوید کا مضمون ''دخمہ: تہذیب کی برہنہ نعش اور گدھ'' معرکے کا مضمون ہے۔ یہ مضمون مابعد جدید تنقید کا عمدہ نمونہ ہے۔ انھوں نے فن پارے کے بطن سے معنی اخذ کیے ہیں۔ جتنے حوالے پیش کیے وہ سب برموقع ہیں، علمیت کا رعب جمانے کے لیے نہیں۔ انھوں نے 1947ء کے بعد کا سیاسی منظرنامہ بھی اختصار اور چابک دستی کے ساتھ پیش کیا۔ بیگ احساس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں پر بھی گفتگو کی ہے۔60 کی دہائی اور 70 کی دہائی کے افسانوں کا جائزہ بھی پیش کیا۔ اس دور کے افسانے اور مابعد جدید افسانے کے فرق کو نہ صرف واضح کیا بلکہ آسان لفظوں میں تشریح بھی کی۔ قدوس جاوید نے فکشن کے نقادوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ انھوں نے انتہائی جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑا معنی خیز جملہ لکھا ہے ''ان دونوں پیران پارسا'' فکشن تنقید کیا اردو تنقید کی جماعت میں ہی ''دوسری صف'' کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ حالاں کہ بحیثیت مجموعی اب اردو میں ان سے بہتر کہنے اور سننے والے بھی اپنی موجودگی درج کروا چکے ہیں۔'' ہمیں ان کی بات سے جزوی اتفاق ہے۔ دوسری صف کے نقاد، قاضی افضال حسین، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ناصر عباس نیر اور شافع قدوائی میں سے اکثر Exhaust ہو چکے ہیں یا پھر ہانپنے لگے ہیں۔ ان متذکرہ بالا دو نقادوں نے تنقید کو جس طرح مالا مال کیا اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ دوسری صف کے نقادوں کی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جسے یاد رکھا جا سکے۔ بہر حال ہم قدوس جاوید کو ایک عمدہ مضمون لکھنے پر دلی کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ مبارز احمد۔ دہلی

پروفیسر بیگ احساس صاحب ____ تسلیمات!

''دخمہ'' پر قدوس جاوید کا مضمون پڑھ کر ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑا۔ انھوں نے دخمہ کے بہانے ادب کا عصری منظرنامہ سیاسی پس منظر کے ساتھ بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا۔ ''دخمہ'' کے علاوہ ''حنظل'' کے افسانوں پر بھی تبصرہ کر کے افسانہ نگار کو سمجھنے میں آسانی پیدا کی۔ ایک عرصے کے بعد جان دار تنقیدی مضمون پڑھنے کو ملا۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔ علیزہ بتول۔ پٹنہ

عالی جناب پروفیسر بیگ احساس صاحب!

''ڈگر سے ہٹ کر'' پوری دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ سعیدہ بانو احمد اپنے دور کی بہت ہی اہم براڈ کاسٹر تھیں۔ جس زمانے میں مسلمان گھرانوں کی خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ملازمت کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ سعیدہ بانو آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئیں۔ وہ اپنے خاص انداز میں اردو خبریں پڑھتی تھیں۔ 1966ء میں اردو پروڈیوسر ہو کر اردو سروس میں آ گئی تھیں۔ ''ڈگر سے ہٹ کر'' میں انھوں نے بھوپال اور لکھنو کے معاشرے کو زندہ کر دیا۔ میر سمیع اللہ بختیاری۔ بھوپال

مکرمی ____ تسلیمات!

رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی کی تحریر ہم بہت شوق

سے پڑھتے ہیں۔ رانی صاحبہ نے بڑے متاثر کن انداز میں اپنی آپ بیتی لکھی اور حیدرآباد کی تہذیب، رسوم، پکوان اور اہم واقعات کو پیش کیا۔ اب وہ نواب میر اصغر حسین کے حالات سے ہمیں روشناس کروا رہی ہیں۔ ان واقعات کا رنگ کچھ اور ہے لیکن دلچسپ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ رانی صاحبہ مختلف موضوعات اور شخصیات پر لکھتی رہیں۔

منیزہ مہوش۔ دربھنگہ

محترمی ____ تسلیمات!

محترمہ لکشمی دیوی راج کا مختصر سا مضمون ''گذشتہ حیدرآباد'' پڑھ کر بے پناہ مسرت ہوئی۔ انتہائی اختصار کے ساتھ مختصر لیکن معنی خیز جملوں میں انھوں نے ایک شہر آشوب لکھا ہے۔ محترمہ لکشمی دیوی راج وقتاً فوقتاً ایسے مضامین سے قارئین سب رس کو نوازتی رہیں تو حیدرآباد کے ماضی کا روشن باب وا ہوگا۔ مضمون پڑھ کر شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کیا کیا کھو دیا۔ بدلے میں جو پایا وہ قیمتی ہے یا وہ جو کھو گیا اس کی قدر و قیمت زیادہ تھی؟

یونس جمیل۔ حیدرآباد

مکرمی ____ سلام مسنون!

سب رس ملا۔ حسب معمول رسالے میں مضامین، آپ بیتی، یادیں، افسانے، شاعری سب ہی کچھ ہے۔ شاعری کا حصہ معیاری ہے لیکن ترتیب میں آپ نے اسے سب سے آخر میں رکھا۔ ہمارے شعراء رسائل میں تخلیقات چھپوانے کی بجائے مشاعروں پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ ماضی میں رسائل میں چھپنے والے شعرا کو مشاعروں میں پڑھنے والے شاعروں پر فوقیت حاصل تھی۔ اب تو یہ فرق مٹ کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان میں شاعر تو بہت ہیں لیکن کوئی بھی شاعر اپنی شناخت قایم نہ کر سکا جسے شہریار، ندا فاضلی، زیب غوری، بانی، شکیب جلالی، احمد مشتاق، عرفان صدیقی وغیرہ نے اپنی شناخت بنائی تھی۔ موجودہ دور میں فکشن حاوی ہے اور پے در پے ناول منظر عام پر آتے جا رہے ہیں۔ اردو کی پہچان شاعری سے تھی اب یہ پہچان بدل رہی ہے خدا خیر کرے۔

سراج یعقوبی۔ اورنگ آباد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

علی احمد فاطمی

Urdu Department, University of Allahabad

Allahabad

رفیعہ سلیم

Asst. Prof. Department of Urdu

University of Hyderabad - 500 046

غلام نبی کمار

Mohalla, Charari Sharief, Budgam-191112(J&K)

محبوب پاشا اعظمی

Dolour Villa, Flat No. 12, No.4 Amerjan

St.Choolaimedu, Chennai - 600 094

رندسرشار

Tolichowki, Hyderabad - 500 008

غلام مرتضیٰ راہی

Rahi Manzil, Pani - Fatehpur (U.P.) 212 601

عابد علی عابد

10, Gulistan Colony, Badam Nagar,

Aligarh - 202 002

خالد عبادی

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna-4

پی پی سریواستورند

R-16, Sector-XI, Noida - 201 301

جنوں اشرفی

F-03, Nargis House, Opp. Ahmed

Communication, F.C.I. Road, Phulwari Sharif,

Patna 801 505

رفیق ساجد

35/H/1, Gora Chand Road,

Saira Manzil, 2nd Floor, Kolkata 700 014

پروین شیر

1 River Court,Apt 3006 ,Jersey City

NJ 07310 - U.S.A.

اصغر شمیم

C/o Baitul Qasim, 12-3-H/1, Patwar Bagan Lane,

Kolkata-9

شارق عدیل

P.O. Marehra, Dist: ETAH - U.P. 207 401

کھڑے ہوئے :- بلونت سنگھ - جگن ناتھ آزاد - ساحر لدھیانوی
کرسیوں پر بیٹھے ہوئے :- بسمل سعیدی جوش ملیح آبادی جاں نثار اختر دیوندر ستیارتھی - مجاز لکھنوی
سامنے :- عرش ملسیانی

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-10 October, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے معتبر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطی، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ وزٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469